کووڈ19 (پہلی بازی)
ناول
ساگر سندیلو

کووڈ—19 (پہلی بازی)

(ناول)

تحریر

ساگرسندیلو

سال: اپریل2020

آن لائن ایڈیشن

دنیا بدل رہی ہے۔ ان کی سوچ سے بھی پہلے جو اس کو بدلنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔

فضا میں ایک عجیب سی اداسی چھائی ہوئی ہے، ویران سڑکیں اور ہُو کا عالم۔۔۔ وبا پوری طرح دنیا کو اپنی گرفت میں لے چکی ہے۔ کیا شہر کیا دیہات، کیا پنڈ کیا ڈھوک۔۔۔ ہر طرف اک خوف ہے اور ناامیدی جو دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ پوری دنیا سے آنے والے خبریں دل دہلانے کے لئے کافی ہیں: کہ پچاس لاکھ سے زیادہ لوگ بیماری کے بستر پہ زندگی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اموات کے اعداد دن بہ دن بڑھ رہے ہیں، اس دوران کہیں، کہیں سے کوئی امید افزا خبر ملتی بھی مل جاتی ہے، لیکن مایوسی اتنے زور سے چیخ رہی ہے کہ امید کے پاؤں سے ابھرنے والی ہلکی سی آہٹ اس میں کہیں دب سی جاتی ہے۔۔ وبا آدھی دنیا میں پھیل کر اپنے پنجے گاڑ چکی ہے۔۔۔ یہ کراچی ہے۔۔ روشنیوں کا شہر۔۔ جہاں زندگی دن رات سڑکوں پر رواں دواں رہتی ہے۔ وبا سے بے خبر لوگ اپنے کاموں میں مگن یہاں وہاں اپنے روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہیں۔ لیکن بہت دیر تک ایسا نہیں چلے گا۔

فروری کی تیرہ تاریخ تھی جب نجم ارشد کراچی ائرپورٹ کے انٹرنیشنل ارائیول سے باہر نکلا، سامنے نظر دوڑائی تو چند کیبز کھڑی تھی۔ایک ٹیکسی کے قریب آکر اس نے ڈرائیور سے ریگل چوک چلنے کے بارے میں بات کی۔

ہاں جناب، صدر چلنا ہے؟

جی سر بلکل چلیں گے

اچھا، کیا چارج کریں گے؟

میٹر کے حساب سے سر جو کرایہ بنے گا، وہی ہو گا۔ڈرائیور نے کہا

چلیں ٹھیک ہے۔ نجم نے کہا، ڈرائیور نے ڈگی میں سامان رکھا، تب تک وہ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔کراچی کا موسم نارمل تھا، نہ ٹھنڈک کا احساس نہ گرمی۔۔ہوا کے جھونکے فضا میں خوشگوار احساس چھوڑ رہے تھے۔ سیٹ پہ بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے بالوں کو انگلیوں سے کنگھی کی، اور سائیڈ مرر میں خود کو دیکھا، چہرہ پر ہلکی زردی سی محسوس ہوئی۔تب تک ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا اور اب گاڑی اپنی منزل کی طرف رواں تھی۔ نجم درمیانے قد کا خوبصورت نوجوان تھا، چہرے پر ہلکی سے شیو رکھتا تھا، ریگل چوک پہ

الیکٹرانکس کا کاروبار کرتا تھا، ایران میں تین ہفتے زیارات کر کے وطن واپس آیا تھا۔ جہاں جہاں وہ گیا تھا سارے مقامات اس کے ذہن میں کسی فلم کی طرح چل رہے تھے، اور ان لمحوں کو وہ اب بھی ایسے ہی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ گاڑی میں نہیں بلکہ ان مقامات پر موجود ہو۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں عقیدت کا سمندر ساد کھائی دے رہا تھا۔ قریب آدھے گھنٹے بعد گاڑی ریگل چوک پر پہنچ چکی تھی، جہاں وہ اک فلیٹ میں اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ گاڑی رکی تو وہ حقیقت کی دنیا میں واپس لوٹ آیا، کرایہ جو کہ چار سئو پینسٹھ روپے بنا تھا، ادا کر کہ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور اس عمارت میں داخل ہو گیا، جس میں تیسرے فلور پر اس کا فلیٹ تھا۔ ساتھ ہی یہ شکر بھی کر رہا تھا کہ فلائیٹ صبح کی تھی اور ابھی روڈ پہ اتنی ٹریفک نہیں تھی، ورنہ آدھے گھنٹے کا سفر ایک گھنٹے میں ہونا بھی اکثر مشکل ہو جاتا ہے۔

دروازہ زریں بیبی نے کھولا تھا، اپنی والدہ کو سامنے دیکھ کر وہ جھکا اس کے پائوں کو چھولیا، ماں نے بیٹے کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا بلائیں لیں۔ شفیق صاحب ٹی وی لائونج میں بیٹھے ہوئے خبریں دیکھ رہے تھے، بیٹے کو سامنے پایا تو اٹھے اور دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ اور پھر صوفوں پر بیٹھ کہ سفر

کے حال احوال ہونے لگے، بھائی کی آواز سن کے صفیہ ،جو کچن میں ناشتہ تیار کر رہی تھے باہر آگئی، وہ نجم سے دو سال چھوٹی تھی، بھائی سے ملکر وہ دوبارہ کچن میں ناشتہ بنانے چلی گئی۔ ناشتہ کے ٹیبل پر بیٹھے شفیق صاحب نے محسوس کیا کہ نجم نے پراٹھے سے دو تین نوالے ہی توڑے ہیں اور باقی ویسا کا ویسا رکھ چھوڑا ہے، جب کہ وہ چائے پینے میں مگن تھا۔ کیوں بیٹا طبیعت تو ٹھیک ہے نہ، پراٹھہ نہیں لے رہے؟ والد کی آواز پر نجم چونکا۔ جی بابا جانی، ٹھیک ہے بس شاید سفر کی تھکن ہے، اس لئے پراٹھا مزہ نہیں دے رہا، یہ کہتے ہوئے اس نے چائے کا سپ بھرا، لیکن چائے کا ذائقہ بھی اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔ دو گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے کپ ٹیبل پر رکھ دیا، جس میں ابھی آدھی چائے موجود تھی۔ بابا نے اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا تو وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ بیڈ پہ لیٹتے ہوے اسے خیال آیا کہ ایران میں بھی اس کی طبیعت دو دن ٹھیک نہیں رہی تھے، شاید دوبارہ بخار چڑھ رہا تھا، جس کی وجہ سے ناشتہ کیا نہیں گیا۔ شام کو ڈاکٹر کے پاس جائوں گا، یہ سوچتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور نیند کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ صبح نے 8 بج رہے تھے، ابھی شہر پوری طرح جاگا نہیں تھا اسلئے نیچے گلی سے جو شور کی آوازیں آتی ہیں وہ ابھی غائب تھیں۔ شام

ہوئی تو دوست بھی پہنچ گئے، اور پھر وہ رات دیر تک دوستوں کے ساتھ باہر ہی رہا، کھانا باہر کھایا، حالانکہ سر درد محسوس کر تا رہا، لیکن شدت ایسی نہ تھی کہ فورن اسے کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کا خیال آجاتا۔ دوستوں کی محفل ختم ہوئی تو گھر کے لئے نکل پڑا، اماں ابا کیوں کہ سویرے جلدی اٹھتے تھے، لہٰذا وہ سو چکے تھے لیکن بھائی کے انتظار میں بہن ابھی تک جاگ رہی تھی۔ نجم نے بیل بجائی تو اسی نے آکر دروازہ کھولا تھوڑی دیر باتیں کیں اور پھر دونوں اپنے اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلے گئے، نجم کو تھوڑا سا جسم گرم محسوس ہوا لیکن اس نے سوچا کہ سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے ایسا محسوس کر رہا ہے اور پھر وہ بیڈ پر لیٹ گیا، جانے کب اسے نیند نے اپنے آغوش میں لے لیا۔ نیند انسان کی دوست ہے کہ دن بھر کے تھکے ہارے جسموں کی توانائی بحال کرتی ہے، رات رات بھر جاگ کر ڈیوٹی دینے والوں کے لئے دن میں نیند کا میسر آنا کسی خزانے کے ملنے جیسا ہوتا ہے۔ نیند انسان کی دشمن بھی ہے، یہ تاک میں بیٹھے دشمنوں کو حملہ کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے، اکثر لوگوں کی جمع پونجی اسی نیند کہ وجہ سے چور چرا کے لے جاتے ہیں اور پیچھے خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ نجم کو بھی جب نیند نے اپنے آغوش میں لیا تو اسے معلوم نہ تھا کہ ایک چھپا ہوا دشمن

گھات لگائے بیٹھا ہو گا جو اس پر حملہ کر دیگا، رات کے کسی پہر وہ اچانک اٹھ بیٹھا ،اس کو سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی اور اچانک سے کھانسی بھی ہونے لگی تھی، تھوڑی دیر تو اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا کہ شائد طبعیت بحال ہو جائے لیکن۔۔جب کھانسی کا دورہ شدید ہو گیا اور سانس بلکل بھاری بھاری محسوس ہونے لگا تو وہ اپنے کمرے سے نکلا ساتھ والے کمرے کا دروازہ بجایا، صفیہ جو نیند میں تھی آواز سن کر اٹھ بیٹھی اور دروازا کھولا تو بھائی کا زرد پڑتا چہرہ دیکھ کر اس کے ہوش ہی اڑ گئے اور پھر کچھ دیر بعد ہی وہ اپنے والد کے ساتھ اک ہسپتال کی ایمر جنسی میں موجود تھا، ایمر جنسی میں جو صورتحال اس نے دیکھی تو اس کی حالت اور غیر ہو گئی، کیوں کہ اسے دوسرے مریضوں سے الگ تھلک رکھا گیا تھا اور جو ڈاکٹر اس کا معائنہ کر رہا تھا وہ ایسے لباس میں تھا کہ اس پر خلاساز کا گماں ہو رہا تھا، اور تب شفیق صاحب کو ڈاکٹر نے سائڈ پر لے جا کر کہا کہ ہمیں شک ہے کہ آپ کے بیٹے کو کورونا ہے۔۔الفاظ کیا تھا جیسے کسی نے شفیق صاحب کے پائوں سے زمین کھینچ لی ہو اس کا چہرہ زرد پڑ گیا، باپ نے اک نظر سامنے بیڈ پہ لیٹے بیٹے پر ڈالی، ہاتھ سے بالوں کو سہلایا اور دھیرے سے بولا: اب؟

اللہ رحم کرے گا، ابھی رپورٹ آنے میں ٹائم لگے گا، لیکن جو سمپٹمز ہیں وہ سارے کورونا کے ہیں، لیکن آپ نہ گھبرائیں، اٹھانوے فیصد مریض ٹھیک ہو جاتے ہیں، امید ہے آپ کا بیٹا جلد ہی صحتیاب ہو جائے گا۔ آپسے درخواست ہے کہ آپ اپنے بیٹے کے قریب نہ جائیں کیوں کہ یہ معتدی بیماری ہے، خطرہ ہے آپ کو بھی لگ سکتی ہے یہ کہ کر ڈاکٹر وہاں سے چلا گیا۔ حالانکہ کورونا کی خبریں میڈیا میں کافی دنوں سے چل رہی تھی، لیکن شفیق صاحب کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کا بیٹا اس وبا کا نشانہ بن جائے گا، تھوڑی ہی دیر بعد پھر وہی ڈاکٹر آیا اور شفیق صاحب کو اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے گیا، جہاں اس نے کچھ سوالات پوچھے۔ قریب تین گھنٹے کے انتظار کے بعد جب ٹیسٹ پازیٹو آئے تب ڈاکٹر نے شفیق صاحب کو بتایا کہ آپ کی پوری فیملی کی ٹیسٹ کرنے ہونگے۔ شفیق صاحب ابھی اس شاک سے نکل ہی نہ پائے تھے کہ موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی، فون پہ زرین بیبی تھی، اس کی آواز سے لگ رہا تھا جیسے رو رہی ہو اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی بیوی کو کچھ بتا پاتا، زرین بیبی نے کہا کہ چینلز پر خبر آرہی ہے کہ نجم کو کورونا ہو گیا ہے۔ اس نے جیسے تیسے اپنی بیوی اور

بیٹی کو فون پر دلاسہ دیا، لیکن یہ نہیں کہا کہ اب سب کے ٹیسٹ ہونے ہیں۔اسے اتنی جلدی چینلز پر خبر چلنے پر حیرت ہو رہی تھی۔

شاہ رخ جس خبر کا کافی دن سے منتظر تھا آج اس کو آخر کار ایک سورس سے مل ہی گئی اور اس کی تو جیسے لاٹری لگ گئی، شاہ رخ جسے ساتھی دوست شاہ کے نام سے بلاتے تھے، وہ کراچی میں ایک چینل کے رپورٹر کے طور پر کام کر رہا تھا اور جب سے کرونا کا سفر ووہان سے آگے بڑھ کے دنیا کے اندر شروع ہوا تھا اور پاکستان میں بھی اس وبا کے پھیلنے کے امکانات بڑھ گئے تھے، تب شاہ کو بیٹ ملی تھی کہ وہ کراچی میں موجود چھوٹے بڑے ہسپتالوں سے خبریں لیتا رہے ۔اور وہ اس خبر کی کھوج میں کئی دن سے ادھر ادھر لوگوں سے رابطے میں تھا۔رات کو وہ ویسے ہی دیر سے سوتا تھا، گزشتہ شب ابھی کچی نیند میں تھا جب اس کے موبائل نے چلانا شروع کر دیا تھا، وہ اٹھا موبائل اٹھا کہ اسکرین پر نظر ڈالی تو اس کا دل جیسے رک سا گیا، اسے یقین ہو گیا کہ وہ خبر آگئی جس کا اس کو شدت سے انتظار تھا۔

کال رسیو کی، کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور خبر کنفرم ہو گئی کہ پاکستان میں کورونا کا پہلا مریض سامنے آ چکا ہے۔پہلے تو اس نے سوچا کہ اپنے نیوز ایڈیٹر کو

خبر پہنچادے، لیکن کچھ سوچ کراس نے یہ ارادہ ملتوی کیا۔بستر سے اٹھ کے اس نے غسل خانے کارخ کیا، پانی کے چھینٹے منہ پہ مار کہ وہ باہر نکلا، صحن میں اس کی بائک کھڑی تھی، بائک کیا تھی ایک کھٹارا تھی جو اسٹارٹ ہونے کے بعد کسی رکشے کے طرح آواز نکالتی تھی، بیس منٹ بعد وہ ہسپتال میں اپنے "جاننے" والے کے پاس موجود تھا، جس نے اس کورات کے اس پہر وہ خبر دی تھی۔ مریض کانام وغیرہ نوٹ کرنے کے بعداس نے اپنے نیوزانچارج کو کال ملائی اور خبراس تک پہنچادی۔ صبح تک ملک کی آدھی سے زیادہ آبادی تک یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ وہ وبا جس کے ٹلنے کی دعائیں کی جارہی تھی، وہ دروازہ کھٹکھٹائے بناملک میں وارد ہوچکی تھی۔

ووہان تین ماہ دس دن پہلے

فوڈاسٹریٹ کے کونے پر بنے ہوئے ہوٹل میں، بلیو جینز براﺅن شرٹ میں ملبوس آمریکی نوجوان، جس نے آنکھوں پر گاگلز پہنے ہوئے تھے موبائل فون سے کھیل رہاتھا۔ جب کسی نے اسے ہیلو مائیک کہ کر مخاطب کیا، اس نے موبائل کی سکرین سے نظر ہٹائی تو سامنے لی فنگ کھڑا تھا۔لی فنگ نے بریف کیس ساتھ والی کرسی پر رکھ دیااور بیٹھ گیا۔اس نے وائیٹ پینٹ اور پھولوں والی

شرٹ پہنی ہوئی تھی۔لی فنگ بیجنگ سے ووہان پہنچا تھا، جہاں اس کی مائک سے
ملاقات طۓ تھی۔ملاقات کے سلسلسے میں گزشتہ 4 مہینوں سے شیڈیول بناتے
رہے تھے۔دونوں اپنے اپنے ملک میں فارماانڈسٹری سے جڑے تھے اور اسی
سلسلسے میں دونوں ایک ڈیل کے سلسلے میں روبرو ملنا چاہتے تھے۔ووہان شہر کی
وہ فوڈ اسٹریٹ جانوروں کی خریدوفروخت کی سب سے بڑی اسٹریٹ
تھی۔جہاں ہر طرح کے جانوروں کی بنی ڈشزاور سوپ وغیرہ ملتے تھے، اور
دوسرے ملکوں خاص کر یورپین ٹوئرسٹ ضرور اس مارکیٹ کارخ کرتے تھے
اور نئی نئی ڈشز سے لطف اندوز ہوتے تھے۔مائک، لی کے آنے سے پہلے سوپ
کاایک پیالا پی چکا تھا۔دونوں میں یہ طۓ ہوا کہ لنچ کے بعد ہوٹل کے کمرے پر
، جہاں مائک ٹھہرا تھا باقی معاملات کو جاکے ڈسکس کریں گے۔اس لئے لی فنگ
نے اپنے آمریکن مہمان کے لئے لنچ کا آرڈر دیا جس میں ووہان کی خاص ڈشز
کے ساتھ اولسٹر کا سوپ بھی شامل تھا۔اس کی خواہش تھی کہ مائک جب واپس
اپنے ملک جائے تو ووہان کے سوپ کا ذائقہ بھی ساتھ لے جائے، اور بغیر شک
کے لنچ بہت مزیدار تھا، مائک نے ویسے بھی ووہان کے جانور بازار کے بارے
میں کافی سن رکھا تھا، اور ایک طرح سے اس کی یہاں کی اسپیشل ڈشز چکھنے کی

خواہش بھی پوری ہو رہی تھی۔ لنچ کے بعد دونوں قریب ہی موجود اس ہوٹل میں چلے گئے جہاں مائک نے رہائش رکھی ہوئی تھی۔

دونوں میں مذاکرات کا دور دو گھنٹے سے بھی طویل تھا، اور اس دوران وہ میز پہ بچھائے ہوئے کاغذات کو بھی بار بار ادھر ادھر کرتے رہے، مائک کا لیپ ٹاپ آن تھا جس پر گوگل میپ کھلا ہوا تھا اور کبھی کبھی وہ اس پر کسی شہر کا نقشہ نکال لیتا تھا۔ آخر کار گفتگو جب اپنے منطقی انجام کو پہنچی، سارے معاملات فائنل ہو چکے، تب لی فنگ جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ مائک نے دروازے تک اسکا ساتھ دیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، مسکرائے اور پھر لی فنگ روانہ ہو گیا۔ مائک واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا، اس نے ایک پیگ بنایا اور مزے مزے سے پینے لگا، سامنے چھوٹی ٹیبل پر لی فنگ کا سفید شیشوں والا چشمہ پڑا ہوا تھا۔ ہوٹل سے باہر نکلتے ہوئے لی فینگ نے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور چشمے کو درست کیا، یہ وہی بلیو کلر کا چشمہ تھا جو کچھ گھنٹے پہلے مائک نے پہنا ہوا تھا۔

یہ 22 نومبر کا دن تھا جب لی فنگ دوبارہ وہاں میں اسی فوڈ اسٹریٹ میں موجود تھا، جہاں اس نے مائک سے ملاقات کی تھی اور دونوں نے فوڈ اسٹریٹ کے مزے مزے کے کھانوں سے لطف اٹھایا تھا۔ اس نے وہاں اولسٹر سوپ کا

آرڈر دیا اور اپنے موبائل سے کھیلنے لگا جب تک کہ سوپ اس کے سامنے ہوتا اس نے سوچا وقت گزار لیا جائے۔ سوپ پینے کے بعد اس نے بل کے پیسے ٹیبل پر چھوڑے اور نکل کھڑا ہوا۔

یہ 7 دسمبر کی ایک یخ بستہ شام تھی جب شیائون لو نگ جو فوڈ اسٹریٹ کے ایک ہوٹل پر بیرا گیری کا کام کرتا تھا، اپنی ڈیوٹی پوری کر کے ہوٹل سے دس منٹ کی دوری پر موجود مارکیٹ سے کچھ چیزیں خریدنے کے لئے نکل پڑا تھا، جب اسے طبعیت میں عجیب سی بے چینی محسوس ہوئی، اس نے اپنے نبض ٹٹولی۔ اسے بخار سان چڑھتا محسوس ہوا تھا، روڈ کراس کر کے وہ اپنے من پسند اسٹور میں گھس گیا اور چیزیں پسند کیں، بل کی ادائگی کر کے شاپر ہاتھ میں لئے اس نے گھر کی راہ لی، لیکن اس آدھے پون گھنٹے کے دوران اس کی طبعیت کی بے چینی بہت بڑھ چکی تھی اور اسے جیسے چکر سے آرہے تھے، جسم زیادہ تپ رہا تھا، اس نے سوچا گھر جانے سے پہلے ڈاکٹر سے معائنہ کرانا چاہئے، کہیں رات کو زیادہ پریشانی کا سامنانہ کرنا پڑ جائے۔

وہ سامان اٹھائے سیدھا قریبی ڈاکٹر کے کلینک پہ چلا گیا۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا، کچھ دیر تک سوالات کرتا رہا اور ایک نسخہ تجویز کیا۔ گھر پہنچ کر شیائو لو نگ

نے دوائی کا ایک ڈوز لیا اور پھر بستر پر لیٹ گیا، لیکن طبعیت کی بے چینی میں کمی کیا آنی تھی، بخار کی شدت بڑھ گئی اور ساتھ ساتھ اب کھانسی بھی شروع ہو چکی تھی، جب کافی دیر تک اس کی حالت نے سنبھلنے کا نام ہی نہ لیا تب اس نے ایمرجنسی پر کال کر دی، قریب چار پانچ منٹ بعد ایمبولینس اس کے دروازے پر پہنچ چکی تھی اور اسے سینٹرل ہسپتال لے جایا گیا- مجوزہ ٹیسٹ مکمل ہوتے ہوتے اس کی حالت غیر ہو چکی تھی اور اب اس کو وینٹی لیٹر پر رکھا گیا تھا۔

جب ٹیسٹ رزلٹ آ گئے تو ڈاکٹرز کو پریشانی لاحق ہو گئی، کیوں کہ جو چیزیں سامنے آ رہی تھی وہ کچھ اچھی نہیں تھی۔ دو دن کے بعد شیا ئولو نگ کی طبعیت میں کچھ بہتری آ چکی تھی۔ لیکن شہر کے اسپتالوں سے دوسرے مریضوں کے داخلے کی رپورٹس آ رہی تھی، ایک ہفتے کے اندر ووہان کی جانوروں والی مارکیٹ کے اطراف والے علاقوں سے دو سئو سے زائد اسی علامتوں والے مریض ہسپتالوں میں آ چکے تھے جن میں سے کچھ کی حالت کافی خراب تھی۔ مزید ایک ہفتہ گزر گیا تب یہ واضع ہو چکا تھا کہ ایک نئی وبائی بیماری شہر کو بہت تیزی سے اپنی گرفت میں لے رہی تھی۔ تین ہفتوں تک حکام اس بات سے آگاہ ہو چکے تھے کہ یہ مرض ایک سے دوسرے میں تیز رفتاری سے منتقل ہونے کی

صلاحیت رکھتا ہے۔ فیصلہ ہو چکا تھا کہ شہر کا باقی علاقوں سے رابطہ جتنی جلدی ہو سکے ختم کیا جائے۔ تا کہ مرض کو پھیلنے سے روکا جاسکے۔ حکام سوچ رہے تھے کہ قبل اس کے کہ زیادہ دیر ہو جائے فیصلے کر لئے جائیں، لیکن ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی تھی۔ وہاں سے جانے والی اکثر فلائٹس مسافروں کے ساتھ اس مرض کو بھی لے کر گئی تھی۔

نئے وبائی مرض کا نام کورونا رکھا گیا۔۔ کورونا ایک قابض ملکہ جس نے ابھی پوری دنیا کو فتح کرنا تھا، اور جس کے سامنے بڑی بڑی سلطنتوں نے گھٹنے ٹیک دینے تھے، بڑی بڑی افواج جس کے سامنے سرینڈر کرنے والی تھیں، بڑے بڑے عقیدے جس کے سامنے مفلوج ہونے والے تھے۔ اس کی دحشت نے ابھی شہر ویراں کرنے تھے، بستیاں اجاڑنی تھی۔ اسٹاک مارکیٹوں کو تالے لگنے تھے، ہوٹلز میں تنہائی ناچنے والی تھی۔ کیا اس کے سامنے سب بے بس ہونے والے تھے؟ بلکل نہیں۔۔ اس کے سامنے اگر کوئی کھڑا رہ سکتا تھا تو وہ تھی سفید آرمی، ڈاکٹروں کی فوج۔

جواد البشیر کا ایران میں کھلونوں کا کاروبار تھا، لمبا تڑنگا سا جواب جس کے چہرے پر ہلکی داڑھی اس کو زیادہ خوبصورت بنا رہی تھے۔ وہ اپنے کاروبار کے لئے چین

سے کھلونے خرید تا تھا، کیوں کہ قیمت کے حساب سے سستے اور جدید نوعیت کے کھلونے مل جاتے تھے، جو نہ صرف آسانی سے ایرانی مارکیٹ میں بک جاتے تھے، بلکہ منافع بھی زیادہ مل جاتا تھا- ابھی وہ وہاں میں ہی تھا جب خبریں آنی شروع ہو گئیں کہ شہر میں ایک وبا پھوٹ پڑی ہے، اس نے وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور جلدی جلدی اپنی خریداری مکمل کرنے لگا۔ جس فلائٹ سے وہ واپس جا رہا تھا اس میں اس کے ساتھ تین طلبا بھی سفر کر رہے تھے جو چین میں پڑھائی کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے، اور کچھ دن کی چھٹیاں منانے کے لئے واپس جا رہے تھے۔ اوران کے ساتھ وبائوں کی ملکہ بھی سفر کر رہی تھے جس کا اگلا حدف قم تھا، عقید تمندوں سے بھرا ہوا شہر قم۔ وہاں کے ہوائی اڈے سے فلائٹ آپریشن جب تک معطل ہوتا، تب تک سینکڑوں مسافر بردار جہاز دنیا کے مختلف ملکوں کی اڑانیں بھرتے رہے۔

کراچی میں پہلے مریض کی رپورٹ پازیٹو آنے کے بعد جیسے کھلبلی سی مچ گئی۔

خبر سے عام لوگ تو پریشان ہوئے ساتھ ساتھ اقتداری حلقوں میں بھی پریشانی کی لہر دوڑ گئی تھی، حالانکہ یہ مصیبت کوئی اچانک سے وارد نہیں ہوئی تھی لیکن سربراہان وقت نے اس حوالے سے وہ تیاریاں نہیں کی تھی جو کہ کرنی چاہیے

تھے۔اوراب جب وبا ملک کے سب سے بڑے شہر میں اتر چکی تب کسی کو سمجھ نہیں آرہی تھے کہ اس سے کس طرح نمٹا جائے اور روکتھام کس طرح کی جائے۔

شام کو صوبوں کے سر براہان اپنے اپنے صوبائی راجدھانی میں منتخب نمائندوں و بیوروکریسی کے ساتھ سر جوڑ کے بیٹھ چکے تھے کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ وبا کی کوئی ویکسین پوری دنیا میں موجود نہیں تھی اور ایک ہی راستہ تھا لاک ڈائون کر کہ مریضوں کو ٹریس کرنا اور ان کو قرنطینہ کر کہ بیماری کو پھیلنے سے روکنے کا۔۔۔ لیکن ایسے فیصلے آسان تو نہیں ہوتے کہ ایک ہی بیٹھک میں ہو جائیں، سو لگاتار میٹنگز کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ کورونا کی وبا ابھی ابھی شہر میں اتری تھی لیکن ابھی لوگوں کو ایک اور وبا کا سامنا کرنا تھا اور وہ تھی بے حسی کی وبا۔

کچھ دن سر جوڑ کر بیٹھنے کے بعد انتظامیہ تیزی سے ہر ممکن فیصلے کر رہی تھی جس سے وبا کے پھیلائو کو روکا جانا ممکن ہو سکتا تھا۔ سرحدوں پر قرنطینہ مرکز بنائے گئے، لاک ڈائون کا سلسلہ شروع ہو گیا، کاروبار بند ہو گئے اور لوگوں کو گھروں تک محدود رہنے کے احکامات جاری کئے گئے۔ لیکن جہاں ہر جگہ بے ترتیبی ہو، وہاں ایسے فیصلوں پر عمل درآمد کروانا کوئی آسان مسئلہ نہ تھا۔

شاہ کی پھٹپٹی اب کراچی کے راستوں پر کبھی ادھر دوڑتی تو کبھی ادھر دوڑتی، شہر میں جتنے قرنطینہ سینٹر بنائے گئے تھے، وہ وہاں سے اپڈیٹ لینے نکل پڑتا، جہاں کہیں سے کوئی مشکوک مریض کی خبر ملتی، وہاں پہنچ جاتا،اس کی محنت کا ثمر تھا کہ اس کے چینل کی ریٹنگ پہلے مریض کی نیوز بریک کرنے کی وجہ سے بڑھ چکی تھی۔

مارچ کے دوسرے ہفتے میں لاک ڈائون کا فیصلہ ہو گیا۔لاک ڈائون شروع ہوا تو ایک طرف دہاڑی دار گھروں میں بے بس ہو کر رہ گئے تو دوسری طرف ذخیرہ اندوزوں کے جاوے ہونے لگے،سیانے بیوپاریوں نے ، جن کی صورتحال پر شروع سے نظر تھی، صحت کے حوالے سے جعلی اور دو نمبر چیزیں مارکیٹ میں اتارنا شروع کر دیں، دودھ اور دالوں کا بھائو چڑھ گیا۔آٹا نایاب ہو گیا اور سبزی کا حصول جوئے شیر لانے کے مترادف ٹھہرا۔پوش علاقوں میں تو قہقہے برقرار رہے،لاک ڈائون کو حسین بنانے کے لئے نت نئے آئیڈیاز نکالے گئے ، لیکن پسماندہ علاقوں میں اب وبا کے خوف سے زیادہ بے روزگاری کا خوف اور بھوک کا ڈر پھیلتا جا رہا تھا۔

کسی کو معلوم نہ تھا کہ صورتحال کہاں جائے گی، لیکن اعداد و شمار بتا رہے تھے زندگی ویسی نہیں رہے گی جیسی پہلے تھی۔ بھوک بھی بڑی عجیب چیز ہے، کھانے کی ہو، دولت کی ہو یا پھر ریٹنگ کی، اس کے آگے سارے قاعدے پھیکے، سارے اصول بے کار اور ساری انسان دوستی کھوکھلی سی نظر آتی ہے۔اب چینلز پہ امید کی خبریں کم اور خوف کی خبریں زیادہ آنے لگیں، جیسے کوئی ریس شروع ہو گئی ہو،۔۔آج اتنے لوگوں کا ٹیسٹ پازیٹو آگیا۔۔آج اتنے لوگ وبا سے جان کی بازی ہار گئے۔۔۔ماہرین کہتے ہیں لاکھوں جانیں جائیں گی۔۔ماہرین کہتے ہیں۔۔ہسپتال کم پڑ جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔

یہ شہر جو مزدوروں کو ماں کی طرح لگتا تھا، اب اس سے خوف سا آنے لگا، جن کے گھر اپنے تھے ان کو تو بس مزدوری کی پریشانی درپیش تھی، لیکن جو رہتے بھی کرائے کے مکانوں میں تھے، ان پر تو مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا، ایک دن، دو دن، تین دن آخر کب تک بغیر مزدوری کے گھر کا چولہا چل سکتا تھا، ایندھن نہ ہو تو چولھا نہیں جلتا، اور کھانا نہ ملے تو زندگی رک جاتی ہے۔

لاک ڈاؤن کو ایک ہفتہ ہو چلا تھا، حکومت لوگوں تک راشن پہنچانے کے پلان بنا رہی تھی اور کچھ فلاحی تنظمیں اور مخیر لوگ حقداروں تک راشن بھی پہنچا

رہے تھے ، لیکن دینے والے ہاتھ کم اور لینے والے زیادہ تھے۔ شاہ جب رپورٹنگ کے لئے فیلڈ میں جاتا تو لوگ اس سے یہ پوچھتے کہ لاک ڈاؤن کب ختم ہوگا۔ کیا سرکار بجلی گیس کے بل معاف کر رہی ہے ! ۔ گھر گھر راشن دیا جائے گا اور ایسے کئی سوال، جن کے جواب اس کے پاس نہ ہوتے۔ فلاحی تنظیمیں کام تو کر رہی تھیں لیکن اس نے دیکھا کہ کہیں راشن پہنچا تو کہیں زندگی فاقہ زدہ رہ گئی۔

شاہ رخ کے والدین حیدر آباد میں رہتے تھے اور وہ خود اکیلا ایک چھوٹی آبادی ''جوگی موڑ ''میں ایک کمرے کے مکان میں رہتا تھا۔ چھوٹے سے صحن، باورچی خانے، واش روم پر مشتمل یہ گھر اس کی پسند تو نہ تھا، مگر کم پیسوں میں اچھی رہائش صرف سوچی جاسکتی ہے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ یہ ایک پسماندہ علاقہ تھا جہاں کم لوگ سرکاری ملازمت والے تھے، اکثریت دہاڑی دار مزدوروں کی تھی، آبادی کی دوسری طرف فیکٹریوں کی قطاریں تھیں، اس لئے مزدور پیشہ لوگوں کی اکثریت یہاں رہنے کو ترجیح دیتی تھی۔ پہلے پہل یہاں جوگی برادری نے ڈیرا ڈالا اور کچی جھگیاں بنا کر رہنے لگی۔ لیکن اتنی اچھی زمین کیسے بڑے مگرمچھوں سے چھپ سکتی تھی ۔ زمین قبضہ مافیا کی نظر میں آئی تو

دھڑادھڑ پلاٹنگ ہوتی گئی۔ پکے مکان بڑھنے لگے، جھگیاں کم ہونے لگیں۔ پہلے پہل جن غریب لوگوں نے جھاڑیاں کاٹ کر زمین کو صاف کیا اور جھگیاں بنائیں تھی، اب ان کے پائوں دھیرے دھیرے اکھڑنے لگے تھے۔ کہنے کو تو کراچی شہر ہے لیکن یہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا قانون چلتا ہے۔ یہاں ہر بڑا طاقتور اپنے سے کمزور کو روندھ کر آگے نکل جاتا ہے۔ اور بلکل ایسے ہی ایک چھوٹے قبضہ مافیا نے اپنے سے کمزور جوگی برادری کے پائوں کھدیڑ دیے اور زمین کو پلاٹوں میں تقسیم کر کہ بیچ دیا۔ کچھ لوگوں نے موقع کو غنیمت جانا، پلاٹ خریدے، ایک ایک کمرے کے گھر بنائے اور کرائے پر چڑھا دئے۔ اور ایسے ہی ایک چھوٹے کمرے میں شاہ رخ رہتا تھا۔

اب جب لاک ڈائون شروع ہوا تو لوگ گھروں میں بیٹھ گئے، کچھ دن تو جیسے تیسے گزار لئے، لیکن جب جیبیں خالی ہونے لگیں تو خوف کے ساتھ آبادی میں بے چینی بھی پھیلنے لگی۔ ہر چہرے پر بس اک سوال تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ کچھ لوگ حکومتی اقدامات کو درست کہتے تو کچھ لوگ برا بھلا کہتے۔ لوگوں میں سوچ ابھر رہی تھی کہ وبا سے پہلے بھوک مار ڈالے گی۔

شہر میں مریضوں کی تعداد میں اب بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا، بندش کے باوجود بہت سے علاقے ایسے تھے جہاں لوگوں کی میل جول ہو رہی تھے ۔ جس کی وجہ سے وبا لوگوں میں تیزی سے پھیلنے لگ گئی تھی، سرحدیں بند ہو چکی تھیں اور اب سارے ہی مقامی پھیلائو کے کیسز سامنے آرہے تھے جو کہ خطرے کی بات تھی۔ جب دن میں تین، چار سئو سے زائد نئے کیسز سامنے آنے لگے تو زیادہ متاثر علاقوں میں مزید سختی کردی گئی اور لوگوں کی نقل و حرکت کو حتی الامکان روکنے کے سارے انتظامات کئے گئے۔ انتظامیہ کے سامنے ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ وبا سے متاثر مرنے والوں کی تدفین کیسے اور کہاں کی جائے۔ تین الگ الگ قبرستان اس لئے بنائے گئے، لیکن وبا کا ڈر اس قدر شدید تھا کہ کبھی کبھی جنازے کا بندوبست کرنا بھی مشکل ہو جاتا اور کوئی ڈاکٹر آگے بڑھ کر جنازہ نماز پڑھا لیتا۔

لاک ڈائون تیسرے ہفتے میں تھا۔ صبح کو قریب دس بجے وہ گھر سے پریس کلب جانے کے لئے نکل ہی رہا تھا تو دروازے پر دستک ہوئی، اس نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھا، دروازہ کھولا تو سامنے چار پانچ سال کا ایک بچہ کھڑا تھا جس کے ہاتھ

میں ایک شاپر بھی تھا ۔وہ بچہ اس کے پڑوس میں ہی رہتا تھا،اور اکثر و بیشتر گلی میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے شاہ نے اس کو دیکھا ہوا تھا۔

۔’’جی بیٹا‘‘ شاہ نے بچے سے پوچھا

چاچا آپ روٹی پکا کر دیں گے مجھے، میں آٹا لایا ہوں‘‘ بچے نے شاپر آگے کرتے ہوئے کہا۔

’’بیٹا، کیوں آپ کے گھر میں کوئی نہیں ہے؟ کہیں باہر گئے ہیں؟‘‘

’’اماں کی طبعیت خراب ہے،ابو اس کو اسپتال لے گئے ہیں، اور ہمیں بہت بھوک لگی ہے‘‘

شاہ سوچ میں پڑ گیا، وہ تو چائے بسکٹ کے ساتھ ناشتہ کر کے نکل جاتا تھا، دن بھر باہر ہی کہیں کھا لیتا تھا۔ گھر میں سوائے چائے کے سامان کے اور کچھ نہیں تھا،نہ ہی اس کو روٹی پکانی آتی تھی۔اس نے بچے کی طرف دیکھا،اس کی معصوم صورت، پریشان آنکھیں۔۔ لیکن وہ کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔اس نے بچے کو ٹھہرنے کو کہا اور اندر جا کہ سلائیس کا پیکٹ اٹھا لایا،اس نے بچے کو سلائیس تھماتے ہوئے کہا کہ ’’بیٹا، روٹی تو مجھے پکانی نہیں آتی،اور گھر میں کوئی

عورت بھی نہیں، یہ ڈبل روٹی لے جائو، جب تک آپ کے امی ابو آجائیں" بچے نے خالی ہاتھ پیچھے کر لیا، لیکن شاپر والا ہاتھ ابھی تک سامنے تھا۔وہ ڈبل روٹی لینے سے انکاری تھا۔ بڑی مشکل سے شاہ نے اسے پیکٹ تھمایا،تب وہ بولا" آپ آٹا لیں، ورنہ میں یہ نہیں لوں گا"۔ چھوٹی عمر میں بھی بچے کی خودداری دیکھ کر شاہ کو حیرت ہو رہی تھے۔اس نے بچے کو سمجھایا کہ اس کے گھر میں کوئی عورت نہیں، اور اسے روٹی بنانی نہیں آتی، تو اس طرح آٹا اس کے لئے کسی کام کا نہیں تھا۔ بچہ واپس چلا گیا، وہ گلی میں دس بارہ گھر چھوڑ کر ایک مکان میں جب اندر چلا گیا تب شاہ واپس مڑا، آدھی چائے جو اس نے چھوڑی تھی پی کر اٹھا اور آفس کے لئے نکل پڑا۔ پورا دن یہاں سے وہاں پھٹپٹی دوڑاتے ہوئے بھی اس کے ذہن سے اس معصوم بچے کا چہرہ نہیں نکلا۔

یہی سوچ اس کے ذہن میں گھومتی رہی کہ پتا نہیں بچے کو روٹی ملی بھی یا نہیں؟ پتا نہیں اس کے والدین کب واپس آئے ہونگے۔۔جوگی موڑ میں دو تین کچے پکے ہوٹل تھے جہاں سے کھانا وغیرہ مل جاتا تھا لیکن لاک ڈائون کی وجہ سے وہ بھی بند ہو گئے تھے۔

شاہ رات کو لیٹ گھر پہنچا تھا۔اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ صبح جلدی اٹھ کر وہ اس فیملی کی خیر خبر لے گا۔ جیسے ہی صبح اس کی آنکھ کھلی، ناشتہ کرنے کے بعد وہ باہر نکلا اور جس گھر میں اس نے بچے کو جاتے دیکھا تھا، اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔دوسری بار دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک آدمی باہر نکلا۔وہ شاید اس بچے کا باپ تھا۔

''اسلام و علیکم'' شاہ نے اس کو سلام کیا۔ ''و علیکم اسلام'' اس نے جواب دیا اور سوالیہ نظرں سے شاہ کو دیکھا- ''جی بھائی جان''

وہ قریب چالیس، پینتالیس برس کا ہو گا۔ لیکن زندگی کا کرب اس کے چہرے پر پوری طرح نمایاں تھا، آنکھیں تھکی تھکی اور زرد، ھلکی داڑھی جو آدھی سفید ہو چکی تھی۔

''جی میں سامنے اس (ہاتھ سے اشارا کرتے ہوئے) گھر میں رہتا ہوں، صحافی ہوں'' شاہ نے اپنا تعارف کرایا۔

جی میں جانتا ہوں آپ کو: اس نے جواب دیا۔ کیسے آنا ہوا؟

''اچھا، وہ دراصل کل آپ کا بچہ میرے پاس آیا تھا، روٹی کے لئے ، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میرے پاس کھانا نہیں تھا، ورنہ اس کو دے دیتا'' شاہ نے آنے کا سبب بتایا۔

آپ لوگ کب واپس آئے تھے؟'' اس نے آدمی سے پوچھا۔

''بس بھائی کیا بتائوں۔ دیر ہو گئی تھی، بچے بچارے بھوکے ہی رہے سارا دن، میں بھی کیا کروں، تقدیر نے ایسی زنجیریں پہنائیں ہیں کہ بس۔'' اس آدمی نے سرد آہ بھری۔

شاہ کو لگا شاید لاک ڈائون کی وجہ سے وہ آدمی پریشان تھا۔ اس نے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ ''اگر کوئی ضرورت ہو تو مجھے بتا دیجئے گا، میرے بس میں ہوا تو آپ کی مدد کروں گا''

''جی کیوں نہیں'' اس نے جواب دیا۔ شاہ واپس لوٹ گیا۔

وہ واپس پلٹا تو اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ بڑی مشکل سے اس نے اس صحافی کے سامنے اپنے آنسو روک رکھے تھے، لیکن جیسے ہی اجنبی آنکھوں سے اوجھل ہوا، اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس کا نام شہباز علی تھا۔ دو سال پہلے وہ

لاڑکانہ سے کراچی آیا تھا۔ کبھی اس فیکٹری تو کبھی اس فیکٹری میں کام مل ہی جاتا تھا۔ کبھی کہیں مزدوری کرلیتا تھا اس طرح زندگی کی گاڑی کو دھکیلتا رہا۔ اس کے تین بچے تھے۔دو بیٹے ایک بیٹی۔ایک بیٹا سات سال کا تھا بیٹی ساڑھے پانچ سال کی اور دوسرا بیٹا چار سال کا تھا۔سات مہینے پہلے بیوی جب کینسر کی بیماری کا شکار ہوئی تو اس کے پاؤں کے نیچے سے جیسے زمین سرک گئی۔بیوی کی بیماری سے پہلے زندگی کا پہیہ جیسے تیسے چل رہا تھا لیکن اب جیسے اچانک ہی وہ بوڑھا ہو گیا ہو۔

شہر میں جیسے ہی وبا پھوٹی اور شہر بند ہونے کی باتیں شروع ہوئیں تو اس کی پریشانی بڑھ گئی تھی۔اس نے سوچا یا اللہ! اگر شہر بند ہوا اور فیکٹری بھی بند ہوئی تو کیا ہوگا۔اگر روزی نہ ملی تو گھر کیسے چلے گا، چولھا کیسے جلے گا، گھر کا کرایہ کیسے ادا کروں گا، بیوی کی دوائی کیسے خریدوں گا۔ وہ ہر گھڑی دل ہی دل میں پکارتا یا اللہ میری مدد فرمانا، اس وبا کو ختم کردے یا میرے مولا! میرا تیرے سوا کوئی آسرا نہیں، اس شہر میں کدھر جائوں گا، روزگار نہ ہوا تو میں کس کے سامنے ہاتھ پھیلائوں گا کہ میری مدد کر۔ کون اس اجگر جیسے شہر میں میرا پرسان حال ہوگا میرے مولا!

اور پھر ایک دن شہر میں لاک ڈائون شروع کر دیا گیا۔ وہ جو اپنے دل کو جھوٹے دلاسے دیتا رہتا تھا، جھوٹی امیدیں باندھتا رہتا تھا، سب بیکار گیا۔ فیکٹری بند ہو گئی تھی۔ اور ساتھ ہی جیسے قسمت کے سارے دروازے بھی اس پر بند ہو گئے تھے۔ وہ جس نے بچپن سے طرح طرح کے دکھوں کو جھیلا تھا، اب جیسے زندگی کی بے رحمی سے لڑتے لڑتے تھک گیا تھا۔

وہ چار بھائیوں میں سب سے بڑا تھا، دوسرے بھائی کا نام امید علی، تیسرا عبدالغفار اور سب سے چھوٹے کا نام شاہ محمد تھا۔

شہباز ابھی 14 سال کا تھا جب اس کا باپ دنیا سے گزر گیا۔ تھوڑی بہت زمین تھی جس سے تھوڑے دانے آجاتے تھے اور ایک امرودوں کا باغ تھا۔ جو سردیوں میں ٹھیکے پر دے دیا جاتا تھا۔ لیکن اس سے کسی گھر میں چولھا جلنا ممکن نہیں تھا۔ بھائی چھوٹے تھے۔ سر سے باپ کا سایہ اٹھا تو اسے احساس ہوا کہ زندگی کسی تپتے سورج کی مانند ہوتی ہے۔ لیکن اب اسے اسی تپتی دھوپ میں کسی شجر کی طرح اپنے چھوٹے بھائیوں کے لئے سایہ بننا تھا۔

زندگی کی تلخ حقیقت کا سامنا کرنے لئے اس نے پہلا قدم اٹھایا، محلے میں کچھ لوگوں کے پاس مال مویشی تھے اور اس نے چارے کا ذمہ اٹھالیا اور اس طرح مہینے میں کچھ روپے نقد اس کے ہاتھ میں آجاتے تھے اور وہ اپنے خون پسینے کی کمائی اپنی ماں کے ہاتھ میں رکھ دیتا تھا۔ زندگی کی گاڑی کو اس نے ٹریک پر ڈال دیا تھا لیکن رفتار بہت دھیمی تھی۔ پڑھائی میں پہلے ہی کمزور تھا اور باپ کی وفات کے بعد سکول بھی کہیں پیچھے رہ گیا۔ لیکن اس نے بھائیوں کی پڑھائی جاری رکھی، یہ سوچتے ہوئے کہ دو لفظ پڑھ لیں گے تو زندگی کے حساب کتاب میں کہیں نقصان نہیں اٹھائیں گے۔

لیکن زندگی اتنی سیدھی نہیں ہوتی، جتنی نظر آتی ہے،اور غریبوں کے لئے تو یہ کتے کی دم کی طرح ٹیڑھی ہوتی ہے لاکھ اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرو، سیدھی نہیں ہوتی۔ لیکن شہباز کو زندگی کریم ڈنو کے اس کھوتے کی طرح لگتی تھی جو چلتے چلتے اچانک ہی رک جاتا تھا اور پھر چابک کی مار بھی اسے ہلا جلا نہیں سکتی تھی۔ کریم ڈنو اس کے ماموں کا دوست تھا۔ دونوں دوست مل کر زمین میں ہل چلاتے، کھیت اگاتے اور مل بانٹ کر اس سے گزارا کرتے تھے۔

مال مویشیوں کی خدمت کے باوجود بھی جب حالات درست نہ ہوئے تب اس نے سوچا کہ کوئی اور کام کرنا چاہئے، جس کے کچھ زیادہ پیسے ملیں تاکہ گھر والے سکون سے پیٹ بھر کر کھا سکیں۔ سو اس نے دودھ کا کاروبار شروع کیا۔ وہ گائوں سے دودھ اکٹھا کرتا اور پھر سائکل پر دودھ کے ڈرم باندھ کر شہر لے جاتا اور ہوٹل والوں کو بیچتا۔ یہ کام اسے اچھا لگا۔ کیوں کہ اس میں اچھے پیسے اس کو بچ جاتے تھے۔ آٹھ سال ایسے ہی نکل گئے، بھائیوں کی پڑھائی جاری رہی لیکن وہ بھی پڑھائی میں اتنے اچھے نہیں تھے، جتنی محنت ان کا بڑا بھائی کرتا تھا۔ ماں اسے اکثر کہتی کہ بھائیوں کو بھی کسی کام دھندے سے لگادے، پڑھتے تو ویسے بھی نہیں کم سے کم تمھارا ہاتھ بٹا لیں گے۔ گھر میں دو روپے زیادہ آئیں گے تو کچھ سامان بھی لے لیں گے کل کلاں تم سب نے شادیاں کرنی ہیں۔ اس نے سوچا اماں کہتی تو ٹھیک ہی ہے گھر بھی ٹوٹا پھوٹا ہے بارش ہوتی ہے تو صحن میں اتنا پانی جمع نہیں ہوتا جتنا چھت ٹپکنے سے کمروں میں جمع ہو جاتا ہے۔

لیکن پھر اس نے چھوٹی بھائیوں کو اپنے ساتھ کام میں لگانے والا فیصلہ موخر کر دیا۔ اس نے سوچا ابھی پڑھ رہے ہیں، جب پڑھ لکھ لیں گے تو پھر دیکھی جائے گی۔ ابھی تو میری بانہوں میں دم ہے، ابھی میں گھر چلا سکتا ہوں۔ اب

بڑے شہر میں اس نے مستقل گراہک بن گئے تھے، صبح سویرے نکلتا تو ہوٹلوں پر دودھ دے کر جلدی ہی فارغ ہو جاتا تھا۔ شہر آنا جانا لگا رہا تو نئی دوستیاں بھی بننے لگی۔ ایسے ہی آتے جاتے شہباز کی جان پہچان گاڑیوں کے مستری استاد شریف سے ہو گئی۔ باقرانی روڈ پر قبرستان کے ساتھ ہی استاد شفن کی دکان تھی۔ اب دودھ ہوٹلوں تک پہنچانے کے بعد شہباز کا زیادہ وقت ادکان پر گزرنے لگا تھا۔ وہیں پر اس نے پہلی بار سگریٹ پیا تھا۔ اس نے ذہن میں دبی دبی خواہش جنم لینے لگی کہ مجھے بھی یہ کام سیکھنا چاہیئے۔ اسے لگتا تھا اس کام میں پیسے زیادہ ہیں۔ پھر ایک دن ہمت کر کے اس نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ استاد شفن نے اسے خوشدلی سے کام سکھانے کی حامی بھری، اور ایسے وہ دودھ بیچنے کے ساتھ ساتھ گاڑیوں کی مرمت کا کام بھی سیکھنے لگ گیا۔

وہ دیکھتا کئی گاڑیوں کو مالک دھکے لگا کر مستری تک پہنچاتے اور وہ ان کے نٹ بولٹ کھول کر انجن کی مرمت کرتا اور پھر گاڑی فر فر چلنے لگتی۔ شاید زندگی بھی ایسی ہی ہوتے ہے: اس نے سوچا۔ کبھی چلتی ہے کبھی پھر اسے دھکے لگانے پڑتے ہیں، مرمت کرنی پڑتی ہے اور پھر دوبارہ فر فر چلنے لگتی ہے۔ اور پھر ایک دن بلکل کھٹارا گاڑی کی طرح آگے چلنے سے انکار کر دیتی ہے۔

نئے کام میں اس کا دل لگ گیا تو پرانے سے جی چرانے لگا۔ وہ سوچتا کیا پوری زندگی ایسے ہی سائکل پر ٹانگیں مارتے گزارنی پڑے گی۔ ایسے تو گوڈے گھٹے گھس جائیں گے۔ اور پھر ایک دن پرانا کام چھوڑ کر وہ فل ٹائم مکینک کا کام کرنے لگا۔ اپنی محنت اور لگن سے اس نے گاڑیوں کی مرمت کا کافی کام سیکھ لیا تھا، اور استاد اگر شہر سے دو چار دن باہر جاتا تو یہ دکان چلا لیتا تھا بنا کسی پریشانی کے۔ اب اس نے پہلا کام چھوڑ، دوسرے کو کل وقتی اپنا لیا اور زندگی کی گاڑی بھی ایسے ہی دھکیلتا رہا۔ صبح کو سائکل پر نکلتا، پورا دن دکان پہ لگاتا اور رات گئے واپس آتا۔

یہ سردیوں کا آغاز تھا، نومبر آدھا گزر چکا تھا۔ ایک رات جب کام سے گھر واپس لوٹا تو ماں حسب معمول ہاتھ دھو کر روٹی کا انتظار کرنے لگا۔ ماں روٹی لے آئی اور اس کے سامنے رکھ کر ساتھ ہی پڑی دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی۔ یہ بات خلاف معمول تھی کیوں کہ ہمیشہ اس کی ماں روٹی اس کو دے کر اپنی چارپائی پر جا کہ سو جاتی تھی۔

اس نے لقمہ چباتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بیٹے کی سوالیہ نظروں کو سمجھ گئی اور پھر دھیرے دھیرے اپنی بات شروع کی۔

دیکھو بیٹا، اللہ سائیں کا شکر ہے کہ اب تم سہی جگہ پر کام کرنے لگے ہو۔ اچھے پیسے بھی لے آتے ہو۔ گھر کا نظام اب سہی چل رہا ہے۔ ماشااللہ سے جوان ہو گئے ہو۔ اس لئے کافی دن سے میرے من میں چل رہا تھا کہ اب تمھاری شادی کرنی چاہئے۔ اس نے اپنی بات مکمل کی اور بیٹے کا چہرہ تکنے لگ گئی۔

شہباز چپ رہا اور کھانا کھاتا رہا۔ جب آخری نوالہ اس کے حلق سے اتر چکا تب اس نے اپنے کپڑوں سے ہاتھ صاف کئے۔

اماں شادی کے لئے لڑکی چاہئے ہوتی ہے'' اس نے ہنستے ہوئے ماں سے کہا۔

''میرے شہزادے بیٹے کے لئے بھلا لڑکیوں کی کمی ہو گی، میں نے لڑکی دیکھ رکھی ہے، بس ادھر تم ہاں کرو تو کل ہی بات چلاتی ہوں'' ماں کی بات سن کر اس کے دل میں خوشی کے لڈو پھوٹنے لگے تھے۔ وہ تو کب سے یہ بات دل میں لئے گھوم رہا تھا، لیکن پھر اپنی ماں سے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی اس کی۔

ماں بیٹے کی رضامندی دیکھ کہ خوش ہو گئی ، اور وہ الگ پوری رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند آئی تو خواب میں اپنے آپ کو دولھے کے لباس میں پایا، شادمانے بج رہے تھے۔ صبح وہ کام پر چلا گیا۔ اس کے تینوں بھائی جو ابھی کوئی کام

دھندہ نہیں کرتے تھے، ادھر اُدھر نکل جاتے تھے اپنے یاروں دوستوں کے پاس۔تب اس کی ماں مائی مٹھاں کے پاس چلی گئی۔مائی مٹھاں اس کی خالہ زاد بہن تھی، اور چار گھر چھوڑ کر رہتی تھی۔اس کی دو بیٹیاں اور 5 بیٹے تھے۔زیبو(شہباز کی ماں) نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ مٹھاں کی بڑی بیٹی مہراں کا رشتہ شہباز کے لئے مانگے گی۔اسے یقین تھا کہ مٹھاں اس کو انکار نہیں کرے گی۔ کیوں کہ دونوں گھرانے مالی حالات میں ایک جیسے تھے۔شہباز تو پھر بھی چار کتابیں پڑھا تھا، مٹھاں کی تو ساری اولاد ان پڑھ تھی، لڑکیاں گھر میں سلائی کڑھائی کرتی اور بیٹے اس کے زمین سنبھالتے۔سردیاں ہوتی تو قریب والی زمین میں وہ سبزیاں اگاتے تھے، اور مٹھاں اپنی بہن زیبل کو کبھی پالک دے جاتی تو کبھی ہرے پیاز اور لہسن بھیج دیتی۔دونوں بچپن کی سہیلیاں بھی تھی اور دل بھی خوب لگتا تھا آپس میں دونوں کا۔اس لئے زیبل کو یقین تھا کہ اس کی بہن جیسی مٹھاں اس کو انکار نہیں کرے گی۔

مٹھاں جو اس وقت دہی سے بھرے مٹکے کو بلو کر اس سے لسی بنا رہی تھی، جیسے ہے زیبل کو دیکھا تو اس کے چہرے پر مسکان آگئی۔آئو آئو ادی زیبو۔۔

زیبل نے بھی ہنس کر سلام کیا اور اس کے قریب پڑی چارپائی پر بیٹھ گئی۔دونوں نے ایک دوسرے کا حال حوال پوچھا،سب کی خیر خبر لی۔زیبل کا دل تو کر رہا تھا کہ فورن ہی اپنے دل کی بات اس کے سامنے رکھ دے، لیکن اس کو بات شروع کرنے لئے الفاظ جیسے مل نہیں رہے تھے۔اس لئے ادھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی،اور مٹھاں کی باتوں کے جواب میں بھی ہوں ہاں کرتی جا رہی تھی۔پھر جب مٹھاں مٹکے سی مکھن کو لسی سے الگ کرنے میں مشغول ہوئی تب زیبل نے موقع مناسب سمجھا اپنی بات شروع کرنے کے لئے۔

"ادی مٹھاں آج میں تو تمھارے پاس ایک امید لے کر آئی ہوں" اس نے مٹھاں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں بولی ادی، ایسا کیا کام ہے جو میری بہن کو مجھ سے پڑ گیا ہے" مٹھاں اپنے کام میں مگن جواب دیتی ہے۔

"ادی میں تو تم سے مہراں کا ہاتھ اپنے میر کے لئے مانگنے آئی ہوں" زیبل نے بات پوری کر کے مٹھاں کے چہرے کی طرف دیکھا کہ اس کے چہرے پر کا

تاثرات آتے ہیں۔ مٹھاں کے چہرے پر خوشی کے تاثر دیکھ کر وہ دل ہی دل میں خوش ہو گئی۔

مٹھاں بات سن کر تھوڑی دیر چپ رہی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ بات اس کو پسند آگئی ہے۔اس نے مکھن کا پیڑا بنایا اور اس پلیٹ میں رکھنے کے بعد وہ پیچھے مڑ کر زیبل کی طرف چہرہ کر کے بیٹھ گئی تھی۔ ''ادی، مہراں تو تمھاری ہی بیٹی ہے، لیکن مہراں کے ابا سے بھی پوچھنا ہو گا، تم کچھ دن صبر کر لو میں کسی اچھے موقعے پر اس سے بات کر کے تمھیں جواب دوں گی۔ ''

''ٹھیک ہے ادی مٹھاں ! لیکن دیکھو میں بڑی امید لے کر آئی ہوں، مجھے مایوس مت کرنا، اداحاجی کو راضی کرنا اب تمھارا کام ہے میں کہہ دیتی ہوں'' زیبل نے ہنستے ہوئے اسے کہا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں، بس اب تم مجھ پر چھوڑ دو، میں جانوں اور حاجی جانے اب، وہ انکار نہیں کریں گے، لیکن آپس میں مشورہ تو کرنا پڑتا ہے ایسی باتوں کے لئے ادی'' مٹھاں نے اس کو تسلی دی۔

''مہراں اور بھا گبھری نظر نہیں آ رہی ہیں'' زیبل نے پوچھا

''وہ چاچی نصیباں کے گھر گئی ہوئی ہیں، تمھیں تو پتا ہے نہ وہ اگلے مہینے بیٹے کی شادی کر رہی ہے تو اس نے بلایا تھا دونوں کو، کہ تھوڑا بہت کام میں ہاتھ بٹا لیں۔ میں نے بھی کہا کیوں نہیں، بھلا ایسے موقعے پر اپنی بہن بیٹیاں کام نہیں کریں گی تو کیا باہر والی عورتیں آئیں گی''

پھر کچھ دیر تک باتیں کرنے کے بعد زیبل نے مٹھاں سے اجازت لی اور گھر واپس لوٹ گئی،اس کو پختہ یقین تھا کہ حاجی اور مٹھاں انکار نہیں کریں گی اور بہت جلد اس کے بیٹے کی شادی ہو جائے گی۔

اور اس کی سوچ غلط بھی نہیں تھی،دوسرے ہفتے ہی مٹھاں نے اسے پیغام بھجوایا کہ رات کو کھانے کے بعد وہ اس کے گھر آ جائے،کوئی ضروری کام ہے۔

زیبل کو اندازہ ہو گیا کہ ہو نہ ہو وہی رشتے والی بات ہو گی۔ کسی چیز کا انتظار ہو تو لمحے صدیوں کے برابر ہو جاتے ہیں اور انسان کو لگتا ہے جیسے وقت کہیں رک سا گیا ہے۔ زیبل کو بھی ایسے ہی لگ رہا تھا جیسے سردی کا وہ چھوٹا سا دن جون جولائی کے دنوں کی طرح لمبا ہو گیا تھا اور کسی طرح شام ہونے ہی نہیں پا رہی

تھی۔ لیکن وقت کو پکڑ کے رکھو یا ڈھیل دو، وہ تو اپنی رفتار سے گزرتا ہے۔ اسے نہ کسی کے انتظار سے فرق پڑتا ہے نہ کسی کے چاہنے سے اس کی رفتار دھیمی ہوتی ہے۔ سبھی عام دنوں کی طرح وہ دن بھی ڈھل گیا اور شام ہو گئی۔ رات کا کھانا جلدی جلدی ختم کر کے زیبل مٹھاں کے گھر کے طرف چلی۔ اس نے اپنے بیٹے امید علی کو بتا دیا تھا کہ شاید اسے دیر ہو جائے تو وہ آج کہیں نہ جائے گھر پر ہی رہے۔

مٹھاں، حاجی (مٹھاں کا شوہر)، اس کے بیٹے اندر والے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، جبکہ صحن میں مہراں اور اس کی بہن بیٹھی ہوئی تھی۔ انہوں نے جیسے ہی زیبل کو آتے دیکھا تو اٹھ کر سلام کیا۔ زیبل نے دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا، دعائیں دیں۔ پھر وہ کمرے میں چلی گئی جہاں وہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

آئو آئو ادی زیبل! اس طرف میرے ساتھ آ کے بیٹھو'' مٹھاں نے اس کو اپنی چارپائی کی طرف بلایا اور زیبل وہاں جا کر بیٹھ گئی۔ سب نے بارے بارے خیریت پوچھی۔ پھر تھوڑی دیر تک سب خاموش ہو گئے۔

پھر مٹھاں اپنے شوہر کی طرف (جو سامنے دوسری چارپائی پر اپنے بیٹوں سمیت بیٹھا ہوا تھا) دیکھ کر کہنے لگی۔

"اس دن ادی زیبل آئی تھی میرے پاس، اس نے کہا میں آپ سے بات کروں۔" یہ کہ کر اس نے تھوڑا وقفہ لیا" اصل میں ادی زیبل چاہتی ہے کہ مہراں کا نکاح اس کے بیٹے شہباز سے ہو۔اب آپ کے سارے بیٹے بھی بیٹھے ہوئے ہیں، آپس میں مشورہ کر کہ جو جواب بنتا ہے بچاری کو دے دو"

"ہاں ادی زیبل آپ کیا کہتی ہیں؟" حاجی نے زیبل سے پوچھا

"ادا حاجی کہتے ہیں جہاں پکی ہوئی بیر ہو وہاں پتھر تو لگتے رہتے ہیں۔ہم اور آپ کوئی غیر تو نہیں ہیں، ایک دوسرے کے دیکھے بھالے ہیں۔شہباز بھی ماشااللہ جوان ہو گیا ہے، اپنا کماتا ہے اپنا کھاتا ہے۔کسے کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔اپنے کام دھندے والا ہے۔میرے تو دل کی تمنا ہے کہ اگر آپ مہراں میری جھولی میں ڈال دیں تو یہ آپ کا بڑا احسان ہوگا۔"

"برو بر ادی ! سچ کہ رہی ہو ہم غیر بھلا کیوں ہونگے۔اللہ سائیں نہ کرے جو ہم اور آپ غیر ہوں کبھی۔باقی مٹھاں نے مجھ سے بات کی تھی۔میں نے اپنے

بیٹوں سے بات کرلی ہے۔ مہراں آج بھی آپ کی بیٹی ہے تو کل بھی آپ کی بیٹی۔ آپ جب چاہیں نکاح کرا کے اس کو اپنے گھر لے جاسکتی ہیں"

"ادا تمھارا بڑا احسان ہے یہ مجھ پر" زیبل نے کہا۔

حاجی اٹھا اس نے زیبل کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اچھا اب دونوں بیٹھ کر باتیں کریں ہم زرا زمین تک جارہے ہیں آج پانی لگانے کی باری ہے ناں اس لئے" حاجی اور اس کے بیٹے اٹھے اور باہر نکل گئے۔ ان کے باہر جاتے ہی زیبل نے مٹھاں کو جپھی ڈالی اور اس کا شکریہ ادا کرنے لگی۔

حاجی والوں نے ہاں کہی تو شہباز والے شادی کی تیاریوں میں لگ گئے۔ جنوری کے آخری ہفتے میں شہباز کی مہراں سے شادی ہو گئی۔ گو کہ غریب لوگ تھے پھر بھی بڑے زمانے بعد ان کے گھر میں کوئی خوشی کا پروگرام ہو رہا تھا۔ اس لئے برادری اور قریب کے گائوں تک شادی کی دعوت دی گئی تھی۔ شہباز نے شادی کے کھانے کے لئے دو ڈنگر خریدے تھے۔ سب سے مہنگے باسمتی چاولوں کی دیگیں پکائی گئی تھیں۔ مہمانوں کو کھانے کھلانے کی ذمہ داری امید علی اور سوڈھل نے اپنے ذمہ لی تھی۔ سارا کام دیکھنا کرنا، دیگیں تیار کروانا اور

پھر پورے گائوں میں گھر گھر تک کھانا پہنچانے کی ذمہ داری ان لوگوں نے بڑے اچھے انداز سے نبھائی تھی۔

بہو کے آنے سے زبیل کو بھی سہارا مل گیا۔وہ تو مہراں کو بہو نہیں بلکہ بیٹی کی طرح چاہتی تھی، آخر کیوں نہ چاہتی تھی بھی وہ اس کی بہنوں جیسی مٹھاں کی بیٹی۔ مہراں سگھڑ بہو ثابت ہوئی اس نے آتے ہی سارے گھر کی ذمہ داری اٹھا لی۔دن اسی طرح گزرتے رہے،امید علی کو گائوں کے ایک سیٹھ نے اپنے ساتھ شہر میں دکان پر بٹھالیا۔غفار نے چارپائی بننے کا کام سیکھ لیا تھا، سو وہ اپنے کام کا ہو چلا۔رہ گیا شاہ محمد تو اس کو کسی کام سے کوئی رقبت کبھی پیدا ہی نہ ہوئی بس صبح کو نکلتا تو پورا دن کبھی کہاں تو کبھی کہاں گھوم گھام کہ شام کو واپس آجاتا، کبھی تو رات کو دیر دیر تک باہر رہتا۔سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ اپنی ماں کا لاڈلا بھی تھا۔حالانکہ اب اس کی عمر پچیس سال ہو گئی تھی پھر بھی ماں کو چھوٹے بچے کی طرح عزیز تھا۔اسلئے بھائی بھی اسکو کسی کام دھندے کا نہیں کہتے تھے۔جب امید علی کمانے لگا تو ماں اسکے لئے بھی رشتے دیکھنے لگی۔اور ایک دن اس کی شادی بھی اپنی خالہ زاد سے ہو گئی۔گھر میں دو عورتیں آئیں تو کبھی کبھار دونوں میں ان بن ہو جاتی تھی۔ویسے بھی کہتے ہیں جہاں دو

برتن ہونگے تو بجیں گے تو سہی۔ لیکن کبھی زیادہ جھگڑا نہ ہوا۔ دونوں اپنی ساس کا احترام کرتی تھیں۔ زبیل اب بیمار رہنے لگی تھی۔ گوڈوں میں درد رہنے لگا تھا، بڑا علاج کروایا، قریب ہی گائوں تھا ٹھلاہ گوٹھ۔ جہاں بڑے حکیم صاحب ہوتے تھے۔ اس سے بھی دائیاں لیں، لیکن کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ ویسے بھی بڑھاپا ایسی بیماری ہے جس کو کوئی دوا فائدہ نہیں کرتی۔ یہ مرض دن بہ دن بڑھتا ہی جاتا ہے اور ایک دن سانسوں کی ڈوری ٹوٹ جاتی ہے۔

گرمیوں کے دن تھے، پارہ چوالیس سے اوپر جا رہا تھا۔ زبیل پڑوس میں گئی ہوئی تھی۔ واپس آتے آتے دوپہر ہو گئی۔ بہت زیادہ لو چل رہی تھی۔ گھر آتے ہی چارپائی پر گر پڑی، پسینے چھوٹ رہے تھے۔

اس نے بہو کو آواز دی کہ پانی کا گلاس تو لے آئے۔ پانی پیا لیکن جون کی دھوپ اپنا کام کر چکی تھی۔ ادھر پانی کے دو گھونٹ اندر اترے ادھر اس کی سانس بے حال ہونا شروع ہو گئی اور بہو کے دیکھتے دیکھتے حالت غیر ہوتی گئی اور پھر سنبھل نہ سکی۔ چھوٹا سا گائوں تھا، نہ کوئی ڈاکٹر نہ کوئی حکیم۔ ایک بہو ساس کے ہاتھ پائوں دبانے لگی تو دوسری روتی چیختی پڑوسیوں کے گھر پہنچی کہ خالہ کو لو

لگ گئی ہے حالت خراب ہو رہی ہے۔جب تک وہ واپس آئی تب تک دم پرواز کر چکا تھا۔اس رات شہباز بہت رویا تھا۔

کہتے ہیں کہ ماواں ٹھنڈیاں چھاواں۔۔سو جب ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا تو ایک بار پھر جیسے وہ تپتے سورج کے نشانے پر آگیا تھا۔گھر میں بڑے ہوں تو چھوٹوں کی آواز دھیمی رہتی ہے، بڑے چلے جائیں تو سب کی آوازیں اونچی ہو جاتی ہیں۔یہاں بھی ایسا ہی ہونے لگا۔آئے دن دونوں عورتوں میں جھگڑے ہونے لگے۔شاہ محمد تو ماں کے مرنے کے بعد پکا قبرستان میں قائم آستانے پر رہنے لگا۔غفار صبح کو نکلتا تو رات کو آتا۔وہ بھی ہفتے میں ایک دو دن شہر میں دکان پر ہی رک جاتا تھا۔پھر کسی دن گائوں کے کسی بندے نے شہباز کو آ کر پیغام دیا کہ غفار نے شادی کر لی ہے اور اب سسرال والوں کے ساتھ رہتا ہے۔اسے پہلے تو حیرت ہوئی کہ بغیر بتائے ہی شادی کر لی۔نہ بھائیوں کو بلایا نہ ہی کسی اور رشتیدار کو، لیکن پھر چپ ہو گیا۔زندگی کا ہر رنگ اس نے دیکھا ہوا تھا۔اور اب کسی بھی بات پر اسے تعجب نہیں ہوتا تھا۔جذبات جیسے پتھر ہو گئے تھے۔

مہراں کے ہاں تیسرے بچے کی پیدائش ہوئی تو وہ جیسے مرتے مرتے بچی تھی۔ بچہ تو صحتمند تھا لیکن زچہ کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی۔ وہ اکثر اسے دیکھ کر سوچتا کہ مہراں پہلے جیسی نہیں رہی۔ شاید اندر ہی اندر اسے کوئی بیماری کھائے جا رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب مزید بچے نہیں چاہئیں کیوں کہ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اب مہراں نے بچے کو جنم دیا تو شاید وہ زندہ نہ بچ پائے گی۔ اپنے اس فیصلے پر سختی سے عمل کیا تھا۔ زندگی ایسے ہی گزرتی رہی۔ وہ اکثر سوچتا کہ اس مہینے کچھ روپے جوڑ کر مہراں کو بڑے شہر کے کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جائے گا، لیکن پھر جب حساب کتاب کرتا تو پلے کچھ نہ بچتا اور پھر وہی حکیم کے دوائیاں اور وہی بدنصیب مہراں۔

پہلے تو صرف سگریٹ پیتا تھا، لیکن جیسے جیسے پریشانیاں بڑھ رہی تھیں، وہ ان سے بچنے کے لئے نشے میں پڑنے لگا تھا۔ سگریٹ کے بعد چرس اور پھر بات آفیم تک جا پہنچی تھی۔ ظاہر بات تھی کہ یہ سارے نشے مفت میں تو نہیں ہو سکتے تھے، اس لئے آدھی کمائی نشے کے حوالے ہو جاتی، جس سے گھر میں راشن پر فرق پڑ رہا تھا۔ اس کا حل اس نے یہ سوچا کہ واپسی پر راستے میں جو چار پانچ گائوں

پڑتے تھے وہاں کے موالیوں کو چرس اور آفیم بیچتا ہوا آتا اور اس طرح اس کو اپنے لئے جیسے مفت میں چرس اور آفیم مل جاتی تھی۔

گھر کے حالات اب زیادہ بگڑ چکے تھے۔ پہلے تو عورتوں کی آپس میں تو تو، میں میں لگی رہتی تھی ، لیکن کڑواہٹ اور تلخی اب مردوں تک پہنچنے لگی تھی۔ جس طرح پتھر پر پانی کی بوند بوند ٹپکتی رہے تو اس میں سوراخ کر دیتی ہے ویسے ہی رشتے کتنے بھی مضبوط کیوں نہ ہوں مسلسل تلخیاں ان میں دراڑیں ڈال دیتی ہیں اور پھر سنبھالنے سے بھی وہ سنبھل نہیں پاتے۔ اس نے سوچا چند دن کی بات ہے جب مہراں ٹھیک ہو جائے گی، علاج معالجے کا خرچہ کم ہو جائے گا تو گھر کے حالات بھی ٹھیک ہو جائیں گے، اسے لگتا تھا یہ تلخیاں جیسے عارضی ہیں۔ لیکن ایک دن جب شام کو کام سے واپس آیا تو اس غفار بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر اسے خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی اور شاید دکھ بھی۔ دونوں بھائی گلے ملے۔ شہباز نے اس سے شکوہ کیا کہ اس نے بنا بتائے ہی شادی بھی کر لی اور کسی کو شریک بھی نہیں کیا۔ غفار نے شرمندگی سے پہلے تو سر نیچے کر لیا پھر بتایا کہ بس ایک جاننے والے نے رشتہ کرایا ہے، لڑکی والوں کو تھوڑی جلدی تھی اس لئے بس سب کچھ جلدی جلدی ہو گیا، اس لئے وہ کسی

کو بلا نہ سکا۔ لیکن اس کی باتوں سے لگ رہا تھا جیسے وہ جھوٹی کہانی سنا رہا ہے۔ لیکن شہباز نے اس کو مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ جب تک وہ دونوں باتیں کرتے رہے، امید علی بھی آ چکا تھا۔ اس رات کافی دن بعد تینوں بھائیوں نے مل بیٹھ کہ کھانا کھایا تھا۔ کھانے کے بعد باتوں کا دور شروع ہوا، پہلے تو یہاں وہاں کی باتیں ہوتی رہیں، پھر غفار نے بڑے بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا"ادا! اصل میں آج میں ایک کام سے آیا ہوں آپ کے پاس۔"

"بولو"شہباز نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔"بات یہ ہے کہ جہاں میں رہتا ہوں وہاں ایک سستا مکان بک رہا ہے، میں بھی سسرال والوں کے ساتھ رہ رہ کر اب تنگ آگیا ہوں۔ ان کی اپنی فیملی بھی بڑی ہے۔ اس لئے میں وہ مکان لینے کا سوچ رہا ہوں"غفار نے بات مکمل کر کے دونوں بھائیوں کی طرف دیکھا۔

"اچھا، تو اب۔۔"شہباز نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا، ساتھ بیٹھے امید علی کے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"مجھے مدد چاہئے آپ لوگوں کی"غفار نے بڑے بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن ہمارے حالات تو تمھارے سامنے ہیں، کیسے مدد کر سکتے ہیں تمھاری، تمھاری بھابھی کا علاج چل رہا ہے، گھر کی صورتحال بھی تم سے ڈھکی چھپی نہیں ہے'' شہباز نے اسے اب حیرت سے دیکھا تھا، جیسے اس کی بات پر اسے افسوس ہوا ہو۔

''آپ سمجھے نہیں'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے سمجھانا چاہا''میرا مقصد یہ ہے کہ مجھے زمین اور باغ میں سے اپنا حصہ دے دیں تو میں اپنے اور اپنے بچوں کے لئے کچھ کر سکوں''

''زمین۔۔حصہ'' شہباز جیسے چارپائی سے اچھل پڑا۔''پتا بھی ہے کیا کہ رہے ہو غفار'' اس نے غصے سے اپنے بھائی کو دیکھا تھا۔''زمین آدمی کی جڑ ہوتی ہے، جڑ کاٹ جائے تو انسان کہیں کا نہیں رہتا، اس کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں'' اس نے بات پوری کر کہ سگریٹ سلگا لیا اور غصے بھری آنکھوں سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب وہ اپنے کسی بھائی سے اس طرح مخاطب ہوا تھا۔

''زمین میں میرا حصہ تو ہے نہ، یہ تو آپ مانتے ہیں نہ، تو میری مرضی جیسے بھی اس کا استعمال کروں، رکھوں یا بیچ دوں، میرے بچوں کے سر پر چھت نہیں اور آپ اپنی باتیں سنا رہے ہیں'' غفار کا لہجہ بھی تیز ہو گیا تھا۔

ایسی الفاظ کی کڑواہٹ اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی، لیکن آج لگتا تھا جیسے اس کا چھوٹا بھائی نہیں کوئی اور بول رہا ہے۔ اس نے پھر اسے حیرت اور غصے سے دیکھا، سگریٹ کا کش لگایا، دھواں دھیرے دھیرے ہوا میں چھوڑنے لگا، لیکن بولا کچھ بھی نہیں۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہے۔ ''کوئی زمین بھی بیچتا ہے بھلا'' اس نے سوچا۔

''مجھے بھی اپنے حصے کے زمین چاہئے'' یہ الفاظ نہیں تھے، دوسرا چھرا تھا جس کا درد اس نے اپنے دل میں محسوس کیا، یہ آواز امید علی کی تھی۔

''مجھے بھی اپنا حصہ دیں تو بچوں کے لئے مکان بنائوں'' اس نے اپنی بات مکمل کی تھی۔

اب گہری خاموشی ماحول پر چھا گئی۔ ''جیسے تم لوگوں کی مرضی'' اس سے زیادہ وہ بول نہ سکا اور وہاں سے اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ مہراں سو چکی تھی اور بچے

بھی۔ وہ چارپائی پر بڑی دیر تاک کروٹیں بدلتا رہا۔اس کی آنکھوں کے آگے گائوں کو وہ سارے چہرے گھوم رہے تھے، جن کو بڑوں سے ورثے میں بڑی زمین ملی تھی اور پھر جب زمین بیچنے کی لت لگی تو نہ زمین رہی نا ہی رقم، رہ گئی تو پیچھے ان کی ذلت بھری زندگی۔

پھر دیکھتے دیکھتے زمین کا بٹوارہ ہوا، غفار اور امید علی نے تو پہلے سے ہے گراہک دیکھ رکھے تھے، ادھر کھاتے تبدیل ہوئے اور زمین بک گئی، شاہ محمد نے اپنی زمین کی نگرانی بھی بڑے بھائی کو دے دی۔ یہ سب تماشہ دیکھ کر اس کا دل آدھا رہ گیا تھا۔اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی ایسا دن بھی دکھائے گی۔ لیکن یہ سوچ کر خود کو تسلی دینے لگا کہ آخر ان لوگوں کا زمین میں حصہ تھا، ان کی زمین ان کی مرضی۔

ابھی اس کے مقدر میں امتحان لکھے تھے اور زندگی اس کو انہیں کی طرف دھکیل رہی تھی۔ جب ایک دن مہراں کی طبعیت زیادہ بگڑ گئی تو وہ اس کو بڑے شہر کے ایک نامور ڈاکٹر کے پاس لے گیا، جو سب ڈاکٹروں سے زیادہ فیس لیتا تھا، لیکن لوگوں کا ماننا تھا کہ وہ مرض کی پہچان اور علاج کے حوالے سے باقی سب سے قابل تھا۔ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ تجویز کئے۔ اور جب رپورٹس آ گئی تو

اس نے ہولناک انکشاف کیا کہ مہراں کو کینسر ہو گیا تھا، ڈاکٹر نے امید بندھائی تھی کہ اگر مسلسل علاج کرایا جائے تو وہ ٹھیک ہو سکتی تھی۔ اس انکشاف نے شہباز کے پیروں کے نیچے سے جیسی زمین کھینچ لی۔

اس کی آمدنی اتنی نہیں تھی جس سے گھر بھی چلے اور مہراں کا علاج کسی کینسر ہسپتال میں ہو سکے۔ لیکن مہراں اسے اپنی زندگی کی طرح پیاری تھی۔ آخر وہ اس کی بیوی تھی، اسکے بچوں کی ماں۔ ہر دکھ سکھ میں اس نے بلا چوں چراں میر کا ساتھ دیا تھا۔ اس کے دکھوں کی ساتھی تھی۔ زندگی کی ہر مشکل گھڑی میں اس نے صبر اور شکر کیا تھا، کبھی کسی چیز کی کمی کا شکوہ اس کے لبوں پر نہیں آیا تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ جو بھی ہو جائے وہ مہراں کا علاج بڑے ہسپتال میں کرائے گا۔ چاہے اس کے لئے اسے خود کو بھی بیچنا کیوں نہ پڑ جائے۔

اب ایک مسئلہ اس کے سامنے تھا۔ بیماری کا علاج کراچی میں ہو سکتا تھا، اور کراچی اس کے لئے بلکل نیا شہر تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ کبھی کراچی گیا نہیں تھا۔ دکان کے سامان کے سلسلے میں وہ اپنے استاد کے ساتھ تین چار بار وہ کراچی

کا چکر لگا آیا تھا۔ وہاں اس کی جان پہچان کے لوگ بھی رہتے تھے، لیکن شہر کی زندگی اس کو راس نہ تھی۔ لیکن اب جب مجبوری سر پر پڑی تو اس نے سوچا کراچی جانے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ اس نے گھر والی سے مشورہ کیا کہ پہلے وہ جائے کوئی کرائے کا مکان دیکھے، اور پھر مہراں اور بچوں کے لے جائے گا۔ کراچی میں دو ہفتوں کی کوشش کے بعد ایک پہچان والے کے توسط سے اس کو جوگی موڑ میں ایک مکان کرائے پر مل ہی گیا۔ یہ کالونی شہر سے تھوڑی باہر تھی، اس لئے مکانوں کے کرائے نسبتن کم تھے۔ جب یہ کام مکمل ہوا تو وہ گائوں سے بیوی بچوں کو لینے کے لئے واپس گیا۔ اپنے اور شاہ محمد کے حصے کی جو زمین بکنے سے بچ گئی تھی وہ اس نے پانچ سال کے لئے ٹھیکے پر دے دی، اور شاہ محمد کو تاکید کی کہ زمین کا چکر لگاتا رہے۔

کراچی میں اب مہراں کا علاج ایک ہسپتال میں شروع ہو گیا تھا۔ جب علاج کی طرف سے مطمئن ہوا تو پھر کام کے سلسلے میں ادھر اُدھر نکلا، اور آخر کار اسی آبادی سے قریب ہی ایک کپڑے کی فیکٹری میں اسے کام مل گیا تھا۔ زمین ٹھیکے پر دینے سے جو پیسے ملے تھے، وہ دھیرے دھیرے خرچ ہوتے جا رہے تھے۔ اور مہنگے ہسپتال میں علاج کے باجود مہراں کی طبعیت سنبھلنے نہیں پا رہی

تھی۔ بس اب وہ بستر پر پڑی رہتی، جسم سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا۔ صبح وہ پہلے ناشہ وغیرہ بناتا، پھر فیکٹری چلا جاتا، دوپہر کو بچے روٹی تندور سے لے آتے، اور صبح کے سالن سے روٹی کھا لیتے تھے، وہ شام کو کام سے تھکا ہارا واپس آتا تو پھر گھر کے کام میں لگ جاتا اور ایسی زندگی کو گھسیٹ رہا تھا۔

مہراں اب زندگی سے مایوس ہو چکی تھی۔ وہ اکثر شہباز سے کہتی کہ بس علاج بند کر دے، اور کتنا خرچہ کرے گا، لیکن وہ اسے دلاسے دیتا رہتا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ کینسر اب اس کے جسم میں پوری طرح پھیل چکا تھا۔ طبعیت اکثر اچانک سے بگڑ جاتی اور ایمبولنس میں اسے ہسپتال لے جانا پڑتا۔ گائوں سے جتنے پیسے لایا تھا سارے علاج پر لگ چکے تھے، اب بس جو کماتا تھا اس سے کسی طرح گھر میں دال روٹی پکتی اور تھوڑی بہت دوائی آ جاتی۔ جب دوائی کی مقدار کم ہوئی تو مریضہ کا حال اور بگڑ گیا۔

ویسے تو وہ نماز کم ہی پڑھتا تھا، لیکن جیسے جیسے زندگی کے مصائب بڑھتے گئے، اس کے سجدے بھی بڑھتے گئے، ہر نماز کے بعد وہ اللہ کے حضور گڑگڑا کر منتیں کرتا کہ اس کی بیوی ٹھیک ہو جائے، گھر کے حالات ٹھیک ہو جائیں، یہ مصیبتیں جو بچپن سے اس کا پیچھا کرتی چلی آ رہی تھی کسی طرح ختم ہو جائیں،

لیکن ہر بار اس کے ہاتھ خالی ہی رہتے۔ ابھی سردیاں ختم ہوئی تھی اور شہر کا موسم بہتر ہونے لگا تھا جب اس نے پہلی بار سنا کہ دنیا میں ایک نئی بیماری آئی ہے، جو جلدی سے ایک سے دوسرے آدمی میں منتقل ہو جاتی ہے اور شہر کے شہر بیمار پڑ جاتے ہیں، لوگ مر جاتے ہیں۔ اس نے اپنی زندگی میں بس ایک ہی بڑی بیماری کا نام سنا تھا اور وہ تھی ٹی بی۔ وہ جب چھوٹا تھا تب اس کے گائوں میں بھی ایک پورا خاندان ٹی بی کا شکار بن گیا اور پھر ایک ایک کر کے سبھی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ اب اس کے لئے بڑی بیماری بس کینسر تھی۔ ورنہ بخار، سر درد اور دوسری تیسری بیماریوں کی تو اس نے کبھی پرواہ بھی کہاں کی تھی۔

شہر میں نئی وبا کا خطرہ تو تھا لیکن اسے اپنے دکھ کیا کم تھے جو وہ ایسی باتوں کی طرف دھیان دیتا۔ اور پھر اچانک ایک دن اسے پتہ چلا کہ آج کل میں شہر بند ہونے والا ہے، کیوں کہ یہاں بھی وہ بیماری پہنچ چکی ہے۔ اب اس کے حوصلے جواب دینے لگ گئے۔ بس یہی سوچ اسے کھائے جا رہی تھی کہ اگر شہر بند ہوا اور خدانخواستہ فیکٹری بند ہو گئی تو کیا ہو گا؟ وہ گھر کا کرایہ کیسے ادا کرے گا! گھر کیسے چلے گا، مہراں کی دوائی کیسے آئے گی۔ اسی سوچ میں دو تین دن نکل گئے ۔اور پھر ایک دن شام کو فیکٹری سے سب مزدور نکل رہے تھے جب انہیں بتایا

گیا کہ کل سے فیکٹری چودہ دن کے لئے بند ہو رہی ہے۔مایوس مایوس گھر لوٹا۔اس نے سوچا چلو یہ دن بھی گزر جائیں گے،ابھی کچھ پیسے پڑے ہوئے ہیں،آدھے مہینے کا راشن وغیرہ آسکتا ہے۔تب تک اللہ نے چاہا تو فیکٹری کھل جائے گی،پھر کسی سے ادھار پکڑنا آسان ہو جائے گا۔لیکن دو ہفتے گزرے تو سرکار نے لاک ڈائون میں مزید آدھے مہینے کی توسیع کر دی۔اب اس کی پریشانی بڑھ گئی تھی۔صرف وہی نہیں بلکہ اس کالونی میں رہنے والے اکثر لوگ جو فیکٹریوں میں کام کرتے تھے،سب کی حالت دیدنی تھی۔تیسرے ہفتے کے چوتھے دن کوئی آدھی رات تھی جب مہراں نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا،وہ ہڑابڑا کر اٹھ بیٹھا۔"کیا ہوا مہراں"اس نے آنکھیں ملتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"بس عجیب سی بے چینی ہو رہی ہے،سانس رک رہی ہے"مہراں کا چہرہ زردی مائل ہوا پڑا تھا۔

"اچھا،کچھ نہیں ہو گا،اللہ سائیں خیر کرے گا،میں تمھیں پانی دیتا ہوں،پی لو،شاید آج تم نے کھانا زیادہ کھالیا ہے"اس نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا۔اور کچن کے باہر پڑے کولر سے پانی لے آیا۔اس نے دو گھونٹ پانی پی کر گلاس

اسے واپس کر دیا۔ آدھی رات ہو چکی تھی، اس نے سوچا باہر نکل کر کسی ٹیکسی رکشے والے کو دیکھوں، پھر خیال آیا کہ اس ٹائم تو کسی کا ملنا مشکل ہو گا۔ وہ بیٹھ کر اسے تسلیاں دینے لگا۔ صبح صادق کے قریب مہراں کو نیند آگئی تو وہ بھی سو گیا۔ پھر صبح سویرے اٹھ کر جلدی جلدی باہر چلا گیا اور ایک رکشے والے کو لے آیا۔ اور مہراں کو ہسپتال لے گیا۔ بڑے عرصے بعد اس صبح کو بچوں کے لئے ناشتہ تیار نہیں ہو سکا تھا اور اس کی شام کو واپسی تک وہ بھوکے ہی رہے تھے۔ دوسرے دن جب پڑوس میں رہنے والا اخباری رپورٹر اس کے بچوں کی خیریت پوچھنے آیا تب اس کا ایک بار تو دل چاہا کہ وہ اپنی بے بسی اور مجبوری اس کے سامنے بیان کرے، کیا پتہ وہ کسی طرح سرکار سے اسے امداد دلا دے یا کم سے کم مہراں کا علاج سرکاری خرچ سے ہو جائے، لیکن پھر اس کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ مجبوریوں کو یہ موقع دے کہ اس کی غربت کا مزاق بن جائے۔ سب ٹھیک ہے کہہ کر وہ گھر کے اندر چلا گیا تھا۔

اب لاک ڈائون جیسے جیسے بڑھ رہا تھا، گھروں میں فاقے بھی بڑھنے لگے تھے، جو راشن تھا، جو پیسے پڑے ہوئے تھے، وہ آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ پوری کالونی میں یہی صورتحال تھی۔ دو گھر چھوڑ عبدل چاچا رہتا تھا۔ دونوں ٹانگوں سے

معذور، صبح کو گھر سے نکلتا تھا خود کو گھسیٹتا ہوا بڑی سڑک تک جاتا تھا اور وہاں دن بھر بھیک مانگتا اور شام کو واپس آجاتا۔ گلی کے لوگ اس کو دو وقت کا کھانا دیتے تھے۔ ایک دن وہ بھیک مانگنے کے لئے نکلا لیکن پولیس کے ڈنڈے کھا کر واپس آگیا۔ کچھ لوگ سبزیوں کے ٹھیلے لگاتے تھے، وہ بند ہوئے تو ان کے گھروں میں بھی فاقے شروع ہو گئے۔

کچھ لوگ تو باہر نکل جاتے تھے اور پولیس کے ڈنڈے کھا کر کہیں نہ کہیں سے امدادی راشن لے ہی آتے تھے، لیکن شہباز کو ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ ایسی کسی کیمپ پر چلا جائے جہاں سے راشن میسر ہو سکے۔ اس نے سنا تھا باہر پولیس والے بے تحاشہ مارتے تھے اور راشن بھی نصیب کی بازی تھی ملا تو ملا نہیں تو ہاتھ خالی گھر لوٹنا پڑتا تھا۔

لیکن یہ کب تک چل سکتا تھا۔ جب ایک پورا دن بغیر کھانے کے گذر گیا اور بچوں کا بھی بھوک سے برا حال ہو گیا تو اس نے سوچا کسی محلے والے سے تھوڑا راشن شاید مل جائے۔ یہ سوچ کر وہ دو تین دروازوں پر گیا، لیکن سب کے حالات ایک جیسے تھے۔ اس کے ہاتھ خالی ہی رہے۔ پھر اسے اس رپورٹر کا خیال آیا۔ لیکن وہ رات کو دیر سے لوٹتا تھا۔ وہ اس کا انتظار کرنے لگا۔ جب قریب بارہ

بجے اس کی موٹر سائکل کی آواز گلی میں گونجی تب وہ دروازے کھول کے باہر نکلا دور سے اس نے دیکھا کہ رپورٹ اپنی گاڑی دروازے سے اندر کر رہا تھا، اس نے سوچا تھوڑی دیر ٹھہر کے جائے، جب تک وہ کھانا کھالے، لیکن گھر میں بھوکے بچوں کا سوچ کر اس سے رہا نہیں گیا اور وہ آگے بڑھ گیا۔

شاہ نے دروازہ کھولا تو اسے پایا، سلام کے بعد اسے اندر آنے کے لئے کہا۔

"کیسے آنا ہوا"

"بچے دو دن سے بھوکے ہیں، آپ تو صاحب لوگ ہیں، سرکاری لوگوں سے تعلقات ہوتے ہیں آپ لوگوں کے، اگر کہیں سے امداد مل جاتی، راشن مل جاتا تو ذرا آسرا ہو جائے گا" اس نے اپنی بات مختصراً اس کے سامنے رکھی۔

"آپ نے امدادی پروگرام سے پیسے لئے ہیں؟"

"نہیں، یہ کونسا پروگرام ہے" اس نے سوال کیا"

شاہ نے اس کو پھر امدادی پروگرام کے بارے میں پوری تفصیل سمجھائی۔

"لیکن مجھے تو اس کا طریقہ پتہ ہی نہیں" شہباز نے گھبرا کر اس کو دیکھا۔

''چلو کوئی بات نہیں، میں تمھیں رجسٹرڈ کر دیتا ہوں''

اور پھر اس نے اپنے لیپ ٹاپ پر اس کی رجسٹریشن شروع کر دی۔ جب رجسٹریشن سبمٹ کر دی تو لکھا ہوا آگیا کہ یہ اس پروگرام کے لئے مستحق نہیں ہے۔ دونوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ شہباز نے کہا ''میں چلتا ہوں، گھر میں بچے بھوکے بیٹھے روٹی کا انتظار کر رہے ہیں، میں نے سوچا آپ آئیں گے تو شاید آپ کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز موجود ہو''

''اور تو کچھ گھر میں موجود نہیں، یہ دودھ اور بسکٹ پڑے ہیں'' شاہ نے کچن سے بسکٹ کے پیکٹ اور فرج سے ایک لیٹر کا دودھ والا ڈبا نکال کر اسے پکڑا یا۔

اس نے شاہ کا شکریہ ادا کیا اور گھر کو روانہ ہو گیا۔ گلی میں ہلکا اندھیرا تھا، جس نے اس کی آنکھوں کے آنسو چھپا دئے تھے، اس نے دل میں شکر ادا کیا کہ وہ آنسو چھپانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ شاہ اس کو دروازے سے جاتا دیکھ رہا تھا اور بلب کی دھیمی روشنی میں اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ یہ ایک انسان کے دوسرے انسان کے دکھ پر نکلنے والے آنسو تھے۔

جب بسکٹ اور دودھ لے کر گھر پہنچا تو بھوکے بچے آکے اس سے لپٹ گئے، مہراں بستر پر لیٹی ہوئی تھی، زرد چہرے کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں،اور اس کی آنکھیں کسی تاثر سے خالی تھی۔اس نے دود کو گلاسوں میں بھرا، بچوں میں تقسیم کیااور تھوڑاسادودھ اور بسکٹ وہ مہراں کے پاس لے گیا۔اس نے سوالیہ آنکھوں سے شہباز کو دیکھا، جیسے پوچھ رہی ہو کہ تم نے کچھ کھایا ہے! سوالیہ نظروں ک چبھن اس نے اپنے دل میں محسوس کی اور پھر پھیکی ہنسی ہنس کر بولا ''میں تو بھئی ادھر بسکٹ کھا کر آیا ہوں،بچارا بڑا اچھالڑکا ہے'' یہ کہتے ہوئے اس نے سہارے سے مہراں کو بٹھایااور بسکٹ اور دودھ والا گلاس اس کو پکڑا دیا۔

شاہ کو کافی دیر تک نیند نہیں آئی، پورے دن کی خبریں اس کے ذہن میں گھوم رہی تھیں، اب وبا پورے ملک میں اپنے پنجے گاڑھ رہی تھی، جتنی تیزی سے ٹیسٹ ہو رہے اتنی اسپیڈ سے نئے مریض سامنے آنے لگے تھے۔پہلے تو ماہرین یہ خیال پیش کر رہے تھے کہ بیماری سے بوڑھے اور پہلے سے بیمار لوگ زیادہ متاثر ہونگے، لیکن باقی دنیا کے الٹ یہاں پر ادھیڑ عمر کے لوگ اس وبا کے

نشانے پر زیادہ تھے۔ جو لوگ آئسو لیشن میں رکھے گئے تھے ان تک پہنچ تو نہیں تھی، لیکن اندر موجود اپنے دوست ڈاکٹرز سے جو رپورٹس اس کو مل رہی تھیں وہ دل دہلانے کے لئے کافی تھی۔ خدشہ تھا کہ جب تک کوئی ویکسین سامنے آئے لاکھوں لوگ کورونا کا نشانے بن چکے ہونگے۔ اس نے سوچا جہاں دنیا کے بڑے بڑے ممالک ٹھہر نہیں پائے، وہاں غریب ملک کیسے مقابلہ کر پائیں گے۔

دوسرے دن وہ پریس کلب میں چائے پی رہا تھا، جب ایک دوست نے اسے اطلاع دی کہ مل مالکان کی تنظیم نے اعلان کیا ہے کہ مزید لاک ڈائون برداشت نہیں کریں گے۔ مزدور بھوکے مر رہے ہیں اس لئے گورنمنٹ ان کو ملیں چلانے کی اجازت دے۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے، فیکٹریاں چلیں گی تو مزدوروں میں وبا پھیلنے کا خطرہ بڑھ جائے گا" اس نے کہا۔

"بھئی بات ساری پیسے کی ہے" دوست نے کہا "جن کے پاس جتنی زیادہ دولت ہے اس سے بھی زیادہ کمانے کی حوس ہے"

"یہ مروائیں گے لوگوں کو" اس نے دوست کی بات پر ہاں میں سر ہلایا۔اور سوچوں میں ڈوب گیا۔جب اس کا دوست اٹھ کر چلا گیا تو اس نے اپنے جاننے والے ایک سیٹھ کو فون کیا تاکہ صورتحال جان سکے۔سیٹھ نے فون پر تو کچھ نہیں بتایا لیکن اسے ملنے کا ٹائم ضرور دیا۔شاہ نے سوچا کل اس سے کچھ نہ کچھ اگلوالوں گا کہ آخر یہ سیٹھ لوگ کیا سوچ رہے ہیں آجکل۔

اس دن وہ شام کو ہی واپس لوٹ آیا تھا اور ساتھ میں چاول، آٹا، گیہ وغیرہ بھی لیتا ہوا آیا تھا جو اس نے شہباز کے حوالے کیا اور اسے حوصلہ دیا کہ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ بلا تکلف اسے کہ سکتا ہے۔ایک دو دن بعد ایک فلاحی تنظیم اس علاقے میں راشن تقسیم کرنے آئی تھی، جس سے مزدور طبقے کو چند دن کا سہارا مل گیا تھا۔لیکن کسی کو بھروسہ نہیں تھا کہ آنے والے دن کیا گل کھلائیں گے، کیوں کہ جس رفتار سے مرض پھیل رہا تھا یہ بات پکی تھی کہ جلد صورتحال بہتر ہونے کے کوئی آثار نہیں تھے، کم سے کم تین چار ماہ تو کوئی چانس نہیں تھا صورتحال سدھرنے کا۔

شاہ جب سیٹھ سے ملنے کے لئے اس کی رہائشگاہ پر پہنچا تو وہ بڑے تپاک سے اس سے ملا۔ابھی سلام اور خیر خیریت ہی پوچھ رہے تھے کہ فروٹ، بسکٹ اور نمکو

وغیرہ نوکر نے لاکر ان کے سامنے رکھ دئے۔ سیٹھ بڑی خوشدلی سے اس سے گپیں لگارہا تھا۔اس کے گھر بار والدین کے بارے میں پوچھتا رہا۔بیچ میں کہیں اپنے دکھڑے بھی سنا دیتا۔

پھر جب چائے آئی تو سیٹھ نے زرا دھیمے لہجے میں اس سے پوچھا'' ویسے آپ تو ماشااللہ پوری دنیا کی خبریں رکھتے ہیں۔آپ کو کیا لگتا ہے کہ یہاں واقعی کوئی وبا ہے یا بس ایویں خبریں اڑائی جارہی ہیں؟''اس نے حیرت سے سیٹھ کو دیکھا

''سیٹھ صاحب بیماری تو پہنچی ہوئی ہے، اور خوامخواہ کی خبریں کوئی ایک دو بندے اڑا سکتے ہیں پوری دنیا تھوڑی جھوٹ کے پل بنا سکتی ہے''اس نے لہجے کو مناسب بنانے کی کوشش تو کی تھی لیکن ہلکی سی تلخی نمایاں تھی۔سوال بھی ایسا تھا جس پر کوئی ذی ہوش شخص حیران ہوئے بنا رہ نہیں پاتا۔

''اچھا سیٹھ صاحب میں نے سنا ہے آپ کی تنظیم سرکار پر زور دے رہی ہے کہ فیکٹریاں چلانے کی اجازت دی جائے، آپ واقعی ایسا چاہتے ہیں کیا؟''

''دیکھو بھئی ہمیں تو اللہ پاک کا دیا ہوا سب کچھ ہے، دس سال بھی اگر بیٹھ کر کھائیں تو پریشانی نہیں ہوگی''سیٹھ نے بات شروع کی''لیکن یہ جو مزدور طبقہ

ہے وہ کیسے کام اور تنخواہوں کے سوا چل سکتا ہے ؟اس لئے ہم نے ان کی بھلائی کے لئے فیصلہ کیا ہے کہ کم سے کم دوسرا کاروبار نہ سہی فیکٹریاں وغیرہ تو کھلنی چاہئیں''

''سیٹھ صاحب لیکن اس سے وبا پھیلنے کا خطرہ تو بڑھ جائے گا نہ، اللہ نہ کرے اگر کوئی پازیٹیو بندہ فیکٹری میں کام پر آجائے تو کیا ہو گا؟ وہ تو آگے سب کو بیمار کر دے گا''۔

''وہ تو جب ہو گا تب ہو گا نہ شاہ جی۔ لیکن تب تک لوگ تو بھوک سے مر جائیں گے، اب ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ فیکٹریاں بند ہوں اور مزدوروں کو گھر بیٹھے تنخواہ دی جائے، اس سے تو مالکان فٹ پاتھ پر آجائیں گے۔''سیٹھ نے اسے سمجھانا چاہا۔

''سیٹھ صاحب لوگوں کو کچھ سرکار دے رہی ہے کچھ فلاحی تنظیمیں دے رہی ہیں، مخیر حضرات بھی کچھ نہ کچھ سامان پہنچا رہے ہیں''

''یار دیکھو میری بات سمجھنے کی کوشش کرو''سیٹھ جو اس کی باتوں کے دوران پہلو بدلتا رہا تھا، اسے سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا''لوگ تو ویسے بھی مرتے

رہتے ہیں نہ، ہیپاٹائٹس سے لے کر ٹی بی تک کتنے لوگ روزانہ مر جاتے ہیں، لیکن اگر فیکٹریاں اور کاروبار بند ہو گیا تو لوگ بھوک سے مر جائیں گے یا نہیں"

اب سیٹھ کی بات اس کے دماغ میں بیٹھ رہی تھے، اسے لوگوں کے مرنے سے زیادہ اپنے کاروبار کی پڑی ہوئی تھی۔ "یا منافقت تیرا آسرا" اس نے دل میں سوچا۔ حد ہو گئی مطلب لوگوں کی زندگیوں سے زیادہ ان کو اپنے دھندے کی پڑی ہوئی ہے۔ اسے سیٹھ سے مل کر سخت مایوسی ہو رہی تھی۔ ابھی وہ انہیں سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا، کہ سیٹھ نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

یہ رکھ لیں شاہ جی، اگر آپ سے ہو سکے تو فیکٹریاں بند ہونے سے جو مزدور پیشہ طبقہ پریشانی بھگت رہا ہے، اگر اس کو کسی طرح آپ اپنی نیوز میں ہائی لائٹ کرائیں تو لاکھوں ورکرز پر آپ کا احسان ہو گا" سیٹھ نے معنی خیز لہجے میں اسے کہا۔

اس نے دھیرے سے سیٹھ کا لفافے والا ہاتھ پیچھے کیا" مہربانی سیٹھ صاحب آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا" اس نے اٹھتے ہوئے کہا"" میں کوشش کروں گا کہ کسی

طرح دہاڑی دار لوگوں کی بات کو ہائی لائٹ کرا سکوں نیوز میں ، اب مجھے اجازت دیں"۔ وہ وہاں سے نکل تو آیا لیکن سیٹھ کی باتیں اس کے دماغ میں گھوم رہی تھیں۔

جیسے جیسے دن گذرتے جارہے تھے،لاک ڈائون کی صورتحال بھی بگڑتی جارہی تھی۔ کہیں تو پورے پورے بازار کھلے ہوئے تھے اور کہیں پر کرفیو جیسی صورتحال تھی۔ کیسز میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جارہا تھا، ساتھ ساتھ بڑے سیٹھوں، واپاریوں کی طرف سے لاک ڈائون ختم کرنے کے مطالبے بھی زور پکڑتے جارہے تھے، کہیں تو پورے پورے محلے بھوک کے مارے نڈھال ہورہے تھے تو کہیں پر آن لائن فوڈ سپلائرز کی طرف سے پیزے اور برگر پہنچائے جارہے تھے۔ایک طرف لاک ڈائون عذاب کی طرح اترا تھا تو دوسرے طبقے کے لئے جیسے وہ گرمیوں کی چھٹیوں جیسا تھا، بس فرق یہ تھا کہ پہلے وہ چھٹیاں باہر منانے نکل جاتے تھے اور اب گھر پر ہی سارے پروگرام ترتیب دئے جارہے تھے۔

جوگی موڑ کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا، شروع میں تو لوگ گھروں میں بیٹھ گئے، لیکن جیسے جیسے دن بیت رہے تھے، گلیاں لوگوں سے بھرنے لگیں تھی، وہ سارا

دن آپس میں گپیں لڑاتے نظر آتے، جن کے پاس موٹر سائکل تھے وہ امدادی راشن کی تلاش یا ویسے ہی گھومنے کے لئے ادھر اُدھر نکل جاتے تھے۔ شاہ نے اپنی گلی میں رہنے والے لوگوں کو بہت سمجھایا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے وقت کے ساتھ وبا کا خوف لوگوں کے ذہنوں سے نکلتا جا رہا تھا۔ یہ اچھی بات تھی کہ اس پوری آبادی میں کوئی بھی اس بیماری سے متاثر نہیں ہوا تھا۔

شہباز کے گھر میں دوبارہ فاقوں جیسی صورتحال پیدا ہو گئی تھی، جو تھوڑا بہت راشن شاہ نے لا کر دیا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ ادھر مہراں کی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی، گھر میں پیسے ہی نہیں تھے جس سے اس کی دوائی لی جاتی۔ اور پھر ایک رات اس کا درد شدید ہو گیا، شہباز دوڑ کر شاہ کے پاس پہنچا۔ اس سے کچھ پیسے ادھار لئے، شاہ نے ہی ایک ٹیکسی والے کو فون کر کے بلایا اور دونوں ساتھ ہسپتال چلے گئے۔ صبح تک وہ ہسپتال میں ہی رہا اور مہراں کے ٹیسٹ ہوتے رہے۔ شاہ واپس جا چکا تھا اسے کہ کر گیا تھا کہ کوئی کام ہو تو وہ فون کر دے۔ کوئی 10 بجے کے قریب ڈاکٹر نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ تھوڑا حوصلہ دیا اور پھر اسے بتایا کہ کینسر مریضہ کے پورے جسم میں پھیل چکا ہے، اب بس وہ کچھ دنوں کی مہمان ہے۔ بہتر ہے کہ وہ اسے گائوں واپس لے جائے

تاکہ کچھ دن وہ اپنوں کے درمیاں گزار سکے۔اس وقت اس نے دل میں سوچا تھا کہ اپنے۔۔کون سے اپنے۔۔ لیکن ڈاکٹر کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔جب بارہ بجے کے قریب وہ مہراں کو ہسپتال سے گھر لے کر آیا تو فیصلہ کر چکا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے وہ گائوں نہیں جائے گا۔لیکن اندر سے کچھ ٹوٹ گیا تھا۔

بچوں کے لئے ناشتہ بناتے ہوئے پچھلی زندگی کسی فلم کی طرح اس کے دماغ میں چلتی رہی،اسے ماں بہت شدت سے یاد آرہی تھی۔ چھوٹا تھا تو باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا، پھر زندگی میں ہر بار جب وہ دکھی ہوا تھا۔کمزور پڑا تھا،ماں اسے سہارا دیتی اسے سمجھاتی،اس کا حوصلہ بڑھاتی تھی۔اس نے ایک بار سوچا کاش کہ ماں کی قبر اسی شہر میں ہوتی تو میں کچھ دیر جا کہ وہاں بیٹھ جاتا،شاید کہ دل کو سکون آجاتا۔

مہراں نے اب کھانا چھوڑ دیا تھا،دو تین نوالے لیتی اور دو تین گھونٹ پانی اور بس،اور اس نے بھی جیسے روزے رکھ لئے تھے، کھانا بنتا تھا تو بس بچوں کے لئے۔جب بچوں کا کھانا بن جاتا تو مہراں اس سے بھی پوچھتی کہ کیوں نہیں کھا رہے اور وہ چپ ہی رہتا۔کوئی تین چار دن بعد اسے فیکٹری میں ساتھ کام کرنے والے رشید نے آکے بتایا کہ کل فیکٹری کھل رہی ہے، یہ بات سن کر

بھی اسے کوئی خوشی محسوس نہ ہوئی، جیسے اس کے جذبات مر چکے تھے۔اس نے بس ہوں ہاں میں اسے جواب دیا۔ہفتہ ایک گزر گیا، فیکٹری کھلی تھی لیکن شہباز نہیں جارہا تھا۔اب اسے یہ فکر نہیں رہی تھی کہ کام نہیں کرے گا تو پیسے کیسے آئیں گے، ڈاکٹر کے جملے بس اس کے ذہن میں گھومتے رہتے تھے کہ مہراں کے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔دوسرے ہفتے آدھی رات کو مہراں کی سانسیں بگڑنے لگیں، وہ اس کے سرہانے بیٹھا رہا اور فجر کی نماز سے تھوڑی دیر پہلے اس کی زندگی کا دیا بھی بجھ گیا، اور اس کے لئے جیسے صبح ہونے سے پہلے ایک اور تاریک رات آگئی۔دکھوں میں ڈوبی ہوئی اندھیری رات۔اس نے زندگی کا ساتھی کھو دیا تھا۔صبح کو سورج تو نکلا تھا لیکن اس کی زندگی میں روشنی شاید نہیں لکھی تھی، فجر سے تھوڑی دیر بعد اس کے دروازے پر ایمبولینس آکر رکی تھی، بچے روتے روتے دکھ اور تھکن سے نڈھال سو گئے تھے، جب دروازہ زور زور سے پیٹنے کی آواز آئی تو وہ اٹھ کر دروازے پر آیا۔باہر پولیس کے دو سپاہی اور دو تین ڈاکٹر موجود تھے۔اس نے حیرت سے ان سب کو دیکھا۔''آپ کی بیوی کا انتقال ہوا ہے؟''ایک سپاہی نے اس سے پوچھا''جی سر ،لیکن۔۔۔''

''ڈاکٹر صاحب تم سے کچھ سوال کریں گے، ان کے ٹھیک جواب دینا''

سپاہی نے اسے گھورتی آنکھوں سے جیسے تنبیہ کی کہ جھوٹ کی گنجائش نہیں ہے۔

بے وقتی ایمبولنس کی آمد پر اب محلے کے دوسرے لوگ بھی گھروں سے نکل آئے تھے۔

ڈاکٹر مکمل حفاظتی لباس میں تھے، جب کہ سپاہیوں نے صرف ماسک ہی پہنے ہوئے تھے۔ ڈاکٹروں نے مہراں کی بیماری کے بارے میں اس سے سوالات پوچھے، اس کی رپورٹس دیکھیں، ایک آلے سے اس کا بخار چیک کیا، پھر بچوں کا بخار چیک کیا، جب ان کو پوری تسلی ہو گئی کہ مریضہ کینسر کی وجہ سے فوت ہوئی تھی اور کسی بھی قسم کی کورونا کی نشانی اس میں یا خاندان کے کسی فرد میں نہیں ہے تو پھر وہ واپس جانے لگے۔ تب ان میں سے ایک سپاہی شہباز کے قریب آیا اور اسے بازو سے پکڑ کر تھوڑا سائیڈ پر لے گیا۔

''دیکھو ہم نے تو تسلی کر لی ہے کہ مریضہ کا انتقال کینسر کے باعث ہوا ہے، لیکن ایسا نہ ہو پوسٹ مارٹم وغیرہ کرنا پڑ جائے'' سپاہی نے اسے کہا۔

وہ اس کی بات سن کر ڈر گیا۔ سپاہی نے اسے بہت دھیمی آواز میں کہا کہ اگر وہ تھوڑی مٹھائی دے تو یہ نوبت وہ نہیں آنے دیگا۔ اور اس طرح پانچ سئو کا ایک ہرا نوٹ اس کے جیب سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

آج کا انسان تو گدھ سے بھی بد تر ہو گیا ہے" اس نے سوچا۔

۔ جب تک وہ یہاں موجود تھے وہ بس اللہ سے یہی دعا کرتا رہا کہ سب خیر ہو۔ اسے ڈر تھا کہ ایسا نہ ہو وہ میت ہی اٹھا کر لے جائیں کورونا کی مریضہ بنا کر۔ اور پھر ایسے اس کی تدفین کر دی جائے، جیسے باقی کورونا کے باعث مرنے والوں کی ہو رہی تھی۔ بغیر گھر کے افراد کے، بغیر پھولوں والی قبریں، جن پر نہ رونے کے اجازت تھی نہ کچھ دیر بیٹھنے کی۔

گھر میں میت پڑی ہوئی تھی لیکن اس کے پاس اس کو گائوں لے جانے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ محلے کے کچھ گلی میں ہی ہمدردی کی خاطر بیٹھے ہوئے تھے، اس نے شاہ کو آواز دی اور سائیڈ پر لے گیا، اسے اپنی مجبوری سنائی۔ شاہ نے دو ہزار اسے دیئے، اور پیسے اس کے پاس بھی نہیں تھے۔ وہ دونوں جب دوبارہ آکر وہاں بیٹھ گئے تو ایک لڑکا اس کے قریب آیا اور اس کے کان میں کچھ بولنے

لگا۔ وہ اٹھا، اس کا رخ اب چاچا عبدل کے گھر کی طرف تھا، کیوں کہ لڑکے نے اس کو یہی پیغام دیا تھا کہ چاچا اسے بلا رہا ہے۔

اس نے جیسے ہی دروازہ بجایا اندر سے عبدل نے آواز دی کہ اندر آ جائو۔ اندر عبدل صحن میں ہی وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا تھا، پہلے تو اس نے دکھ کا اظہار کیا، اسے حوصلہ دیا اور پھر اپنے ہاتھ میں پکڑے شاپر سے پیسے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ یہ رکھ لو بیٹا، مجھے پتا ہے تمھارے حالات ٹھیک نہیں ہیں کافی دن سے، یہ تمھارے کام آئیں گے۔اس نے پیسے لینے سے پہلے تو انکار کیا، لیکن جب عبدل نے زور دیا تب اس نے پیسے لے لئے، وہ بیس ہزار روپے تھے۔اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ جھک کر اس نے عبدل کے پیر چھو لئے۔اور رو پڑا۔

"ارے ارے روتے نہیں میرے بیٹے، یہ پیسے بھی اللہ پاک کے نام سے ملے ہیں اور اب اس کی راہ میں دے رہا ہوں، میری اکیلی جان کے لئے ان پیسوں کی کوئی اہمیت نہیں، اب جلدی سی جائو، میت کو زیادہ دیر رکھنا مناسب نہیں ہوتا" عبدل نے اسے حوصلہ دیا۔وہ جو کچھ دیر پہلے سپاہی کی وجہ سے انسانیت سے بیزار ہو گیا تھا، اب اس کا بھروسہ دوبارہ قائم ہو چکا تھا۔

اس کو یقین تھا کہ وہ جب یہاں سے جائے گا تو پھر واپسی ممکن نہ رہے گی۔ مستقبل کا خاکہ اس نے سوچ لیا تھا۔ جب ایمبولینس میں میت رکھی جاچکی اور بچے بیٹھ گئے، تب اس نے سب سے ہاتھ ملایا لیکن جب شاہ اس کے سامنے آیا تو دونوں گلے لگ گئے۔ ان چند دنوں میں دونوں میں ایک عجیب سا رشتہ بن چکا تھا، جیسے سگے بھائی ہوں یا اس سے بھی بڑھکر۔ کچھ دیر تک وہ ایسے ہی ایک دوسرے کے گلے لگ کر اپنے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی کوشش میں رہے، اور پھر شہباز خدا حافظ کہہ کر ایمبولینس میں بیٹھ گیا، جس کی اگلی منزل لاڑکانہ تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ لیکن شاہ رخ کافی دیر تک جاتی ہوئی ایمبولنس کی اڑتی ہوئی دھول کو دیکھتا رہا۔

اک بھروسہ لے کر وہ گائوں سے شہر آیا تھا، اور ایک غم لے کر وہ شہر سے گائوں جارہا ہے، اے اللہ اس کو صبر دے" شاہ کے دل سے صدا نکلی۔

کراچی سے قریب بارہ ہزار کلومیٹر دور نیویارک کے ایک گھر میں بیٹھا مائنک وہسکی کے سپ لیتے ہوئے ایک ای میل پڑھ رہا تھا۔ وہ دو مہینوں سے اپنے شہر سے باہر نہیں گیا تھا۔ ورنہ تو اس کا پچھلا پورا سال جیسے ملک سے باہر ہی گذرا تھا-اس دوران وہ کچھ عرصہ جرمنی میں رکا تھا، رشیا گیا اور پھر واپسی کے بعد

ایک چکر اس نے چین کا لگایا تھا۔ جہاں اس کی ملاقات لی فنگ سے ہوئی تھی۔ اور یہ ای میل بھی اسی نے بھیجی تھی۔ جب سے ووہان میں وبا پھوٹی تھی اور پوری دنیا میں پھیلنے لگی تھی، تب سے وہ دونوں ای میل سے ایک دوسرے کے ساتھ رابطے میں رہتے تھے۔ وبا سے جڑی ہر خبر پر اس کی پوری نظر ہوتی تھی۔ دو دن پہلے ہی اس نے ایک مضمون پڑھا تھا۔ جس میں لکھنے والے نے پرانی کتابوں اور لوگوں کی پیشنگوئیوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ دنیا اب اپنے اختتام کو پہنچنے والی ہے۔ وہ بڑی دیر تک لکھنے والے پر ہنستا رہا تھا۔ پیگ ختم کر کے وہ اٹھا۔ آج اس کو بس دو ہی کام تھے، ایک ضروری ای میل بھیجنی تھی اور دوسرا لی فنگ کے ساتھ چیس کھیلنا۔ دو دن سے ان کی گیم ادھوری پڑی ہوئی تھی، لیکن اس نے سوچا آج اس کو مکمل کر کے پھر اٹھیں گے۔

ای میل لکھنے میں اسے گھنٹا ایک لگ گیا تھا۔ کافی بار ڈرافٹ میں تبدیلی کرنی پڑی۔ بالآخر جب پوری بات لکھ چکا، تب اس نے ای میل بیجھ دی۔ وہ بعد میں بھی کچھ دیر اس پر سوچتا رہا۔ ''شاہراہوں پر کاروبار کا زمانہ ختم ہوا، دنیا اب نئی

مار کیٹ کی طرف جا رہی ہے، پہلے لوگوں کو شاک لگے گا، پھر بے بسی نظر آئے گی اور پھر عادت پڑ جائے گی" اس نے ای۔ میل میں لکھے اپنے جملے دہرائے۔

وہسکی دوبارہ گلاس میں انڈیلتے ہوئے جب وہ دوبارہ آن لائن ہوا تو لی فنگ پہلے سے موجود تھا۔ اور دونوں میں ادھوری بازی پھر شروع ہو چکی تھی۔

لی فنگ نے پہلے اس کے پیادے اڑائے، پھر گھوڑوں کو رخصت کیا اور جب توپیں ناکارہ ہو گئیں تب اس نے ایک نظر پوری گیم پر ڈالی۔ مائک اس کی ہر چال کو غور سے دیکھتا لیکن وہ جو بھی بازی چلتا، اس میں کامیاب نہ ہو پاتا۔ لی فنگ نے اپنی آکری چال چل دی تھی، اور مائک کو بیجنگ میں بیٹھے لی فنگ نے ایک میسیج بیجھا جس میں لکھا ہوا تھا

"واشنگٹن والے تمھارا بادشاہ پھنس چکا ہے"

(پہلا حصہ مکمل)